# اصلاح کی فکر کیجئے

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

شائع کردہ

مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
76A/1، مین بازار، اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

(© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | اصلاح کی فکر کیجئے |
| مصنف | : | مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی |
| سال اشاعت | : | مارچ ۲۰۱۰ء |
| صفحات | : | ۶۴ |
| پروف ریڈنگ | : | محمد وقار الدین لطیفی ندوی |
| تعداد اشاعت | : | ایک ہزار |
| قیمت | : | ۴۰/روپے |

**شائع کردہ**

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، نئی دہلی

# فہرست


پیش لفظ: (از: حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری بورڈ)..... ۴
اسلام میں عورت کا مقام: ..... ۶
یتامیٰ کی خبر گیری: ..... ۱۰
غرباء ومساکین کے ساتھ حسن سلوک: ..... ۱۴
خودغرضی: سماج کے ماتھے کا کلنک: ..... ۱۹
ایک خط - ایک تأثر: ..... ۲۴
زبان وبیان: اللہ کی بڑی نعمت: ..... ۲۸
نہی عن المنکر: ..... ۳۴
چند سماجی برائیاں: ..... ۳۹
روشن خیالی، اعتدال پسندی اور اسلام: ..... ۴۵
زکوٰۃ: اسلام کا اہم رکن: ..... ۴۹
اصلاح معاشرہ کے لئے میڈیا کا استعمال: ..... ۵۸
تعلیم کو تجارت نہ بنایئے ..... ۶۲




# پیش لفظ

اسلام اللہ کا ایک پسندیدہ دین ہے اور مکمل نظام حیات ہے، اسلئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ خدا کے ہر حکم پر عمل کرے اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی سنت مبارکہ اور سیرت طیبہ کی اتباع کرے، اسلام دراصل سپردگی وحوالگی کا نام ہے، جب تک انسان پورے طور پر اپنے کو خدا کے حوالہ نہ کردے اور اس کے حکم کے آگے سر نہ جھکا دے، اس وقت تک اسلام ہماری زندگی میں نہیں آسکتا اور نہ مسلم معاشرہ میں اس کی برکت نظر آسکتی ہے، اللہ کا حکم ہے اُدْخُلُوا فِیْ السِّلْمِ کَافَّۃً اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ، یعنی ایسا نہیں کہ بعض حکم پر عمل کریں اور بعض کو چھوڑ دیں، عبادات، معاملات، اخلاق ومعاشرت، غرض ہر شعبۂ زندگی میں اسلامی تعلیمات پر مکمل طور عمل کرنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

اسی موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے محترم مولانا مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی صاحب نائب ناظم امارت شرعیہ، ورکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بہت سارے اصلاحی مضامین لکھے ہیں، جن کا مجموعہ ''اصلاح کی فکر کیجئے'' کے نام سے شائع کیا جارہا

ہے،مولانا کا علم پختہ ہے اور آپ نے مسلم معاشرہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس لئے مولانا کی تحریروں میں حقیقت پسندی بھی ہے اور واقعیت نگاری بھی، اگر اسکو غور سے پڑھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو ایک صالح معاشرہ کی تشکیل عمل میں آسکتی ہے، جو وقت کا اہم تقاضہ ہے، اس لئے کہ اس وقت دنیا، روحانی واخلاقی انحطاط سے دوچار ہے اور صرف ایک امت مسلمہ ہے، جسکو اللہ نے خیر امت کا لقب دیا ہے، وہی پوری دنیا کے سامنے امن وانصاف، اخوت ومساوات، باہمی محبت وہمدردی، غرض کہ انسانیت کے اعلیٰ صفات کا نمونہ پیش کرسکتی ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالی مولانا کی اس کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے اور اس کی افادیت ونافعیت کو عام فرمائے۔

سید نظام الدین
جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
۸؍مارچ ۲۰۱۰ء مطابق ۲۱؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ



# اسلام میں عورتوں کا مقام

جس وقت اسلام کا ظہور ہوا، اور اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت عورتوں کا برا حال تھا، سماج میں ان کے لئے عزت کی کوئی جگہ نہیں تھی، عورتیں صرف ہوس اور شہوت کی تکمیل کا ذریعہ سمجھی جاتی تھیں اور بس۔ انسانوں کو بحیثیت انسان جو حقوق دئے جاتے ہیں، عورتیں ان سب سے محروم تھیں، انہیں ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ایک مرد جب عورت سے اپنی نفسانی خواہشات پوری کرنا چاہتا تو بلا روک ٹوک کر لیتا تھا، سماج میں مہذب کہلانے والے لوگ لڑکیوں کے وجود کو منحوس تصور کرتے، اللہ کی ان بندیوں کو جینے کا حق نہیں تھا، لڑکیاں زندہ دفن کردی جاتیں اور کوئی اس ظالم باپ کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا اور نہ ہی اس قبیح عمل کو برا سمجھا جاتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت کی ناپسندیدہ اور مبغوض حالت کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

**وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَداً وَهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهِ اَيُمْسِكُهُ عَلٰى هُوْنٍ . اَمْ يَدُسُّهُ فِى التُّرَابِ اَلاَ سَاءَ مَايَحْكُمُوْنَ ( نحل)**

ترجمہ: جب ان میں کسی کو بیٹی کی خبر دی جائے تو پورے دن اسکا چہرہ بے رونق

رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے، جس چیز کی اسکو خبر دی گئی، اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے، آیا اس مولود کو ذلت کی حالت پر لئے رہے یا اس کو مٹی میں گاڑ دے، خوب سن لو! انکی یہ تجویز بہت بُری ہے۔

اسلام نے اس بدترین ظلم اور لڑکے لڑکیوں کی تفریق کو مٹایا اور لڑکیوں کو قدرت کا عطیہ اور عظیم نعمت بتایا۔

**يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ اِنَا ثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُوْر** ( شوریٰ )

اس آیت میں اللہ نے لڑکے اور لڑکیوں کو اپنی جانب سے عطیہ قرار دیا؛ بلکہ لڑکیوں کا ذکر لڑکوں سے قبل کیا اس آیت کے ذیل میں امام واثلہ ابن اسقع فرماتے ہیں، بیوی کی سعادت اور نیک بختی میں سے یہ ہے کہ اس کے ہاں پہلے لڑکی پیدا ہو اس لئے کہ اللہ نے قرآن میں پہلے لڑکیوں کا پھر لڑکوں کا ذکر کیا ہے ( ماخوذ از ھدیۃ الام الجدیدۃ ) حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے بیٹے حضرت صالحؒ فرماتے ہیں کہ جب بھی ہمارے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو میرے والد صاحب فرماتے: یہ بہت خوشی کی بات ہے، اس لئے کہ انبیاء علیھم السلام اکثر لڑکیوں کے والد ہوا کرتے تھے۔ خود ہمارے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں، طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ جب کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو فرشتہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمزور ہے، کمزور سے پیدا کی گئی ہے اس کی کفالت کرنے والے کی معاونت کی جائے گی۔ عورت کبھی بیٹی رہتی ہے، کبھی بیوی بنتی ہے اور کبھی ماں۔

اسلام نے اس کی تینوں حالات میں عظمت و اہمیت کو بیان کیا، ایک مرتبہ رسول پاکؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس تین لڑکیاں ہوں اور ان کو ادب سکھائے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور وقت پر اس کی شادی کردے تو اس کیلئے جنت کا فیصلہ ہے۔ **من عال ثلاث بنات فادبھن وزوجھن و احسن الیھن فلہ الجنۃ** ( ترمذی )



ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی کے پاس دو لڑکیاں ہوں تو کیا حکم ہے، فرمایا: اس کے لئے بھی جنت ہے۔ پھر ایک دوسرے صحابیؓ نے دریافت کیا: یا رسول اللہؐ! اگر کسی شخص کے پاس ایک ہی لڑکی ہو اور وہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے تو کیا حکم ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اس کے لئے بھی جنت ہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا: **کن لہ سترا من النار** ( **بخاری** ) اللہ تعالیٰ جس شخص کو لڑکیوں کے ذریعہ کچھ آزمائے اور وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لئے جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔

الغرض متعدد احادیث میں لڑکیوں کے ساتھ حسن معاملہ پر جنت کی بشارت دی گئی۔ خود نبی پاک ﷺ نے اپنی بیٹیوں بالخصوص حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بے پناہ محبت کا مظاہرہ فرمایا۔

پھر وہ لڑکی جب کسی کی بیوی بن جاتی ہے تو شوہر پر بیوی کی عزت و احترام اور نگاہ داشت کو ضروری قرار دیا گیا اور اچھی بیوی کو شوہر کیلئے دنیا کا بہترین متاع قرار دیا۔ فرمایا رسول اکرمؐ نے **ان الدنیا متاع کلھا وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ** (**مسلم**) دنیا کی ہر چیز سامان ہے اور دنیا کا بہترین سامان اچھی بیوی ہے اور مردوں کو حکم دیا کہ اس متاع عزیز کی عزت کرو، فرمایا: **اکرم النساء الا الکریم وما اھانھن الا اللئیم**، عورتوں کی عزت وہی شخص کرتا ہے جو شریف ہو اور اس کی بے عزتی وہی کرتا ہے جو کمینہ ہو، اور ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک تم میں کا وہ شخص بہتر ہے جو اپنی بیوی اور بچوں کے نزدیک بہتر ہے **خیارکم خیارکم الی نسائکم**، اچھا وہی ہے جو بیویوں کے لئے اچھا ہو، یہاں شوہر کو پابند کیا گیا کہ بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، نبی اکرم ﷺ نے اپنے مرض الموت میں بھی نماز کے اہتمام اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا

حکم فرمایا اور خود بھی اپنی بیویوں کے پسندیدہ اور مقبول شوہر کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔

ایک وقت وہ آتا ہے جب وہ ماں بن جاتی ہے اور عمر کے کمزور دور میں پہونچ جاتی ہے، اس وقت اللہ نے لڑکوں کو حکم دیا کہ اگر میری رضا چاہتے ہو تو ماں کی رضا حاصل کرو، ماں کا مقام اتنا اونچا کیا کہ اللہ کے رسول نے فرمادیا **الجنة تحت اقدام امهاتكم** ، جنت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے، تم انکی خدمت کر کے بھی جنت کے حقدار بن سکتے ہو، آپ ﷺ نے ماں کی خدمت کو جہاد جیسے نیک کام پر ترجیح دی اور فرمایا: **ان الله حرم عليكم عقوق الامهات**، اللہ نے تم پر ماں کی نافرمانی کو حرام قرار دیا، اسلامی تعلیمات اور رسول اکرمؐ کی محنت نے رنگ دکھایا اور تھوڑے ہی دنوں میں لڑکیوں کے قاتل باپ اپنے کئے پر شرمندہ ہونے لگے اور بیٹیوں کی کمی کا احساس ان کو ہونے لگا اور ماضی کی غلطیوں پر زاروقطار رو کر اللہ سے توبہ اور معافی کی بھیک مانگنے والے بن گئے۔





# یتامیٰ کی خبر گیری

وہ نابالغ لڑکے اور لڑکیاں، جن کے سروں سے باپ، یا ماں باپ دونوں کا سایۂ عاطفت اٹھ چکا ہو، ایسے شکستہ خاطر اور قابل رحم بچے کو یتیم کہا جاتا ہے، اس معصوم عمر میں ماں باپ کا بچہ پل پل محتاج ہوتا ہے، اگر تھوڑی دیر کے لئے بچہ ماں باپ کو نہ پائے تو بلک بلک کر رونا چلّانا شروع کر دیتا ہے، اور ماں کو دیکھتے ہی یکدم چپ ہو جاتا ہے۔ اب خیال کیجئے ان ننھے منّے بچے اور بچیوں کا، احساس کیجئے ان شکستہ دلوں کا، جو ہمیشہ کے لیے اپنے ماں باپ سے محروم ہو جاتے ہیں، جن کے ناز نخرے اور لاڈ کو پورا کرنے والا اور ان کے اشاروں، کنایوں کا سمجھنے والا کوئی نہیں رہتا، حضور اکرم ﷺ نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان کا پورا پورا خیال رکھو، اور ان کے ذہن و دماغ سے یتیمی کا احساس ختم کراؤ، خود خالق کائنات نے قیامت تک آنے والے یتیموں کی تسلی اور انکے ذہن و دماغ سے احساس کمتری کو ختم کرنے کا نظم کر دیا، وہ اس طرح کہ سب سے چہیتے رسول محمد عربی ﷺ کو یتیم بنایا، آپ ﷺ ابھی شکم مادر ہی میں تھے کہ والد محترم حضرت عبداللہ کا انتقال ہو گیا، اور کم سنی کی عمر میں والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں، پھر اس دریتیم محمد عربی ﷺ نے خود یتیموں کے ساتھ محبت و ہمدردی، احسان کا معاملہ فرمایا، اور ان کے ساتھ حسن

سلوک کی ترغیب دی اور انکے فضائل بیان کئے، اسلام نے انکے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں، مظالم اوران کے مال میں دست درازی کی تمام صورتوں کوحرام قرار دیا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔

**اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا.** ''جولوگ یتیم کے مال کھاجاتے ہیں ظلم وزیادتی کرکے یقیناً وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں، اورعنقریب وہ جہنم کی دہکتی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے یتیموں کی پرورش انکی دیکھ ریکھ کوانتہائی نیک عمل قرار دیا اوراس کے بدلے جنت کے اعلی مقام کی بشارت دی، فرمایا: **انا و کافل الیتیم کھاتین مع الاصابع** (الحدیث) یتیم کی کفالت کرنے والاکل قیامت کے دن مجھ سے حددرجہ قریب ہوگا، جیسے شہادت کی انگلی اوراس کے بغل والی بڑی انگلی قریب ہے، یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے کے فضائل بیان کئے اور یہ بھی تاکید کیا کہ خبردار اس کے یتیم ہونے کی وجہ سے اس کا مہر کم نہ کرو۔

رسول اکرم ﷺ کی بیویوں میں ایک حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں ان کے شوہر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ان سے بہت پیار کرتے تھے اورام سلمہؓ کی ساری ضروریات پوری کرتے تھے، ان کے انتقال سے حضرت ام سلمہؓ کو زبردست صدمہ ہوا، اکثر روتی رہا کرتی تھیں، ابوسلمہؓ نے ایک یتیم لڑکے کو بھی چھوڑا تھا، اس کے چہرے پر یتیمی کے اثرات صاف جھلکتے تھے، رسول اکرم ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیوگی کے صدمہ اور سلمہ کی یتیمی کے احساس کوکم کرنے کی غرض سے ان سے نکاح فرمالیا، اور سلمہ سے کہا کہ اب تم یتیم نہیں ہو۔ اسے اپنے پاس رکھا۔

ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے ایک چھوٹے سے بچے کو دیکھا؛ جو بڑا اداس کسی



گہری سوچ میں مبتلا تھا، رسول اکرم ﷺ نے بھانپ لیا کہ یہ لڑکا پریشان حال ہے، آپ ﷺ نے اس سے خیریت اور حالات معلوم کئے، پتہ چلا کہ وہ لڑکا یتیم ہے اور یتیمی کے غم میں مبتلا ہے، نبی پاک ﷺ اسے اپنے گھر لے آئے اورام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ میری بیوی عائشہ، تمہاری ماں ہے، میں تیرا باپ ہوں، اور یہ حسن وحسین تمہارے بھائی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جوشخص محض اللہ کی رضا جوئی اور یتیموں کی دل جوئی کے لئے اس کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرے تو جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے آئے، اللہ اتنا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا **انا ولی من لا ولی لہ** '' میں اس شخص کا ولی ہوں جس کا کوئی ولی نہیں ہے اور اسکی پرورش میرے ذمہ ہے؛ جس کی کوئی پرورش کرنے والا نہیں ہے۔ الغرض یتیموں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا۔ محفلوں اور مجالس میں اپنے ساتھ ان کو لے جانا، اپنی اولاد کی طرح نرمی سے پیش آنا، ان کو گود میں بیٹھانا، ان سے ہمدردی کا اظہار کرنا، اسلامی تعلیمات اور سیرت نبوی ﷺ کا اہم حصہ ہے، اس لئے کہ وہ جب یتیم ہوگیا اور اب اس کا نسبی باپ دنیا میں نہ رہا تو اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ تم سب مل کر اس کے شرعی باپ بن جاؤ، تاکہ نسبی باپ کا غم اور ملال دور ہوجائے، درجنوں مقامات پر اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں یتیموں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر فرمایا اوران سے اچھا برتاؤ کرنے کی ترغیب دی۔

انسانیت کے کمزورترین فرد یتیموں کے بارے میں مذکورہ بالا احادیث اور قرآنی آیات سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اسلام کی تعلیمات ان کے بارے میں کیا ہیں، اب ذرا ہم لوگ بھی اپنے اپنے دامن میں جھانکیں کہ ہم نے ان یتیموں کے بارے میں کیا سونچا ہے؟ انکے مستقبل کے لئے کیا منصوبے بنائے ہیں، ان کی تعلیم وتربیت کا کیا

نظم کیا ہے؟ رسول اکرم ﷺ نے جنہیں اپنی اولاد کہا، ان کے کھانے پینے پہننے اوڑھنے اور انکی اچھی زندگی کے لئے کیا اقدام کئے ہیں؟ ہم نہیں سمجھتے کہ ان کے لئے ہمارے پاس کوئی منصوبہ اور کوئی پلاننگ ہے، اگر ہم نے انکے لئے کچھ نہیں کیا، ہمارے لڑکے تو لذیذ غذا اور میوہ جات کا مزہ لیں اور یتیم لڑکے بھوک کی صعوبت برداشت کریں۔ ہمارے بچوں کے جسم پر لباس فاخرہ ہو اور یتیموں کے جسم پر بقدر ضرورت بھی کپڑا نہ ہو، ہمارے لڑکے شہر کے سب سے مہنگے اسکول میں تعلیم پائیں، مگر یتیموں کی تعلیم کے لئے مکتب کا بھی نظم نہ ہو، ہم اپنے بچوں کی انگلیاں پکڑ کر صبح بنارس اور شام اودھ کی سیر کرائیں، اور یتیم لڑکے لڑکیاں اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھ کر آنسو بہائیں تو کل قیامت کے دن محمد عربی ﷺ کی موجودگی میں اللہ ہم سے سوال کرے گا اور یتیم سسک سسک کر اپنی بیکسی کا شکوہ کریں گے، تو ہم کیا جواب دیں گے؟ یقیناً ہم سے جواب نہیں بن پڑیگا۔ ضرورت ہے کہ ان بچوں کی فکر کی جائے اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے بھی اجتماعی طور پر منصوبہ بنایا جائے۔

❁ ❁ ❁



# غرباء ومساکین کے ساتھ حسن سلوک

اسلامی طرز زندگی اصلا احکام خدا اور رسول کو، طریقۂ نبوی کے مطابق زندگی میں برتنے سے عبارت ہے، حکم خدا و رسول کی بجا آوری، طریقۂ نبوی کے خلاف ہو یا سرے سے حکم خدا اور رسول کے مطابق نہ ہو، ایسی زندگی کو ہم اسلامی زندگی نہیں کہہ سکتے۔ اسلامی طرز زندگی کا آغاز ایمانیات سے ہوتا ہے اللہ کے معبود ہونے کا یقین، رسول کی رسالت کا اقرار اور دیگر امور کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا جیسا آقا ﷺ نے ہمیں بتایا، اسلامی زندگی کی بنیاد اور اساس ہیں، ارکان اسلام، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، ہماری اسلامی زندگی کو معتدل بناتے اور اسے بیلنس کرتے ہیں، کبر، حرص، بخل اور خودنمائی جیسے امراض ان ارکان کی ادائیگی سے دور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایمانیات اور ارکان اسلام کی ادائیگی پر سختی سے کاربند ہوئے بغیر ہم اسلامی طرز زندگی کا تصور نہیں کر سکتے، ان کے بغیر اگر کوئی اسلامی زندگی کا تصور رکھتا ہے تو وہ محض نعرہ ہے اور نعروں کے پیچھے عمل کی قوت نہ ہو تو تبدیلیاں پیدا نہیں ہوتیں، اور انقلاب نہیں آیا کرتے۔

احکام خدا کی ادائیگی طریقۂ رسول کے مطابق ہونے لگے تو سارے کام عبادت بن جاتے ہیں، اخلاص کی وجہ سے انکی قدر و قیمت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، ان کی وجہ سے معاشرت، معاملات، حصول معیشت کے سارے اسباب بھی اسلامی زندگی کی تکمیل کرتے

ہیں، بندہ جب حقوق اللہ کی ادائیگی میں حساس ہوتا ہے تو حقوق العباد پر عمل آسان ہوجاتا ہے۔حقوق انسانی زندگی میں مسلم، غیر مسلم اور ہر ذات و برادری بلکہ سماج سے متعلق ہیں۔

اسلام نے سماجی زندگی میں وحدت و یکسانیت کا تصور پیش کیا اور اس کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ نسل انسانی کا سلسلہ ایک ہی آدمی سے چلتا ہے، وہ کسی خاص قبیلے، ذات، برادری کا نہیں تھا، وہ مٹی سے بنا تھا، اس کے علاوہ انکی کوئی اور پہچان نہیں تھی، **اِنَّا خَلَقْنَا الاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّار. یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْ رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَۃ**" آقاﷺ نے ارشاد فرمایا: **کلکم بنی آدم و آدم من تراب** تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔

اس تعلق کے نتیجے میں ایک انسان کے دوسرے انسان پر حقوق اور مطالبے بھی ہیں، جنکا پورا کرنا انسانی اور اسلامی تقاضا ہے، اگر اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات دو دو چار کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ انسان سے اپنا تعلق توڑ کر انکے تقاضوں اور ضرورتوں سے صرف نظر کر کے خدا کی قربت حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔رسول پاکﷺ نے ارشاد فرمایا۔**الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ** "مخلوق اللہ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہی ہے جو اللہ کے کنبہ اور عیال کے نزدیک اچھا ہے۔

اسلام نے ہمیں حکم دیا کہ انسانوں کو پیش آنے والے احوال وکوائف سے بھی ہم آگہی رکھیں اور حالات کے مطابق ان کے حقوق اور تقاضوں کو پورا کریں، انسانوں کی بڑی تعداد آج غربت وافلاس، فقر وفاقہ، تنگدستی اور جہالت کی تلخیوں میں زندگی گذار رہی ہے، ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، جو تعلیمی، معاشی اور سماجی اعتبار سے پسماندگی اور خستہ حالی کے شکار ہیں، ان کے بارے میں ہمیں فکرمند رہنا چاہئے۔



اللہ تعالی نے قرآن پاک کی کئی آیات میں غرباء، مساکین، یتیم ونادار اور پسماندگی کی زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے ساتھ ہمدردی، محبت، تعاون اور حسن سلوک کی تاکید فرمائی ہے۔پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ غرباء، مساکین اور مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ ہمدردی کے واقعات سے بھری پڑی ہے، ارکان اسلام میں زکوٰۃ، غربا، مساکین، یتیم و نادار محتاجوں کی اعانت اور دل جوئی ہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے، اس کے علاوہ صدقات واجبہ اور نافلہ کی مختلف شکلوں کے ذریعہ غربا پروری کا حکم دیا گیا۔کوئی مالدار شخص رمضان المبارک میں روزے کی صعوبت تو برداشت کرے لیکن صدقۂ فطر کی ادائیگی کے ذریعہ محتاجوں کی خبر گیری نہ کرے تو روزہ جیسی اہم عبادت بھی آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتی ہے۔صدقۂ فطر کی ادائیگی کے بعد ہی روزہ قبول ہوتا ہے۔

اسی طرح دعائیں بھی انکی برکت سے قبول ہوتی ہیں، خود رسول اکرمﷺ بھی بعض موقعوں پر غرباء کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کرتے نظر آتے ہیں، دعا کے یہ الفاظ مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔**اللھم انصرنا علی الاعداء بعبادک الفقراء المھاجرین** اے اللہ فقراء اور مہاجرین کے طفیل میں دشمنوں پر غلبہ عطا فرما۔ایک حدیث میں ہے کہ کسی شخص پر بعض گناہوں کی وجہ سے خدا کی پکڑ اور اس کا عتاب نازل ہی ہوا چاہتا ہے کہ وہ شخص صدقہ دے کر غربا و مساکین کے دل خوش کر دیتا ہے اور ان کی دعائیں اپنے ساتھ کر لیتا ہے تو اللہ تعالی ان بلاؤں کو روک دیتا ہے۔**الصدقۃ تطفی غضب الرب** رسول اکرمﷺ نے فرمایا کہ صدقہ اللہ کے غضب کی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ایک مرتبہ آپﷺ نے اپنی بیوی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا **یا عائشۃ احبی المساکین فان اللہ بقربک یوم القیامۃ** (مشکوٰۃ) اے عائشہ مسکینوں سے محبت رکھو، اللہ قیامت کے دن اپنی رحمت سے ہم کنار کرے گا۔خود نبی کریمﷺ ضعفاء

مساکین ، غربا اور نادار سے محبت کرتے اور ان کی مجلسوں میں بیٹھا کرتے تھے، کفار ومشرکین نبی کریم ﷺ کو اس پر طعنہ دیتے اور ملامتیں بھی کرتے کہ محمد ﷺ کی نشست وبر خاست سماج اور معاشرہ کے رذیل اور کمزور لوگوں کے ساتھ ہے۔

حدیث کی کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک صحابی جو دیہات کے رہنے والے تھے اور بودو باش بھی دیہاتیوں کی طرح تھی ،شکل وشباہت اور قد وقامت کے لحاظ سے بھی جاذبیت اور کشش نہیں رکھتے تھے، کالے کلوٹے تھے ،لیکن رسول اکرم ﷺ سے بڑی محبت کرتے تھے، دیہات سے بار ہا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے اور دیہاتی تحفہ بھی ساتھ لاتے تھے، رسول اکرم ﷺ بھی ان سے شفقت و پیار کا معاملہ فرماتے اور ان کے آنے کا انتظار کرتے ، جب وہ آتے تو بڑی بے تکلفی کا برتاؤ ان سے فرماتے ، صحابہ تعجب کرتے کہ اس دیہاتی کالے کلوٹے آدمی میں کیا خوبی ہے، جو اللہ کے پیارے رسول ان سے ایسا معاملہ فرماتے ہیں، اس صحابی کا نام حضرت زاہر رضی اللہ عنہ تھا۔

ایک مرتبہ حضرت زاہر بازار میں بیٹھے کچھ بیچ رہے تھے، پیچھے سے اچانک نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور چپکے سے اپنے دست مبارک سے حضرت زاہر کی دونوں آنکھیں بند کردیں۔ جس طرح ایک دوست اپنے بے تکلف دوست کے ساتھ کرتا ہے، حضرت زاہر پریشان کہ کس نے بھرے بازار میں ایسا کیا ، وہ پوری قوت سے نبی کریم ﷺ کے دست مبارک کو اپنی آنکھوں سے ہٹا رہے ہیں، اسی قوت سے رسول ﷺ اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر جمارہے ہیں، تھوڑی دیر میں نبی کریم ﷺ کے دست مبارک کی نرمی سے وہ سمجھ گئے کہ یہ ہاتھ کوئی معمولی ہاتھ نہیں ہے ، یہ رسول ﷺ کا مبارک ہاتھ ہے، اس احساس کے ساتھ وہ ان ہاتھوں کو اپنے چہرہ اور اپنی آنکھوں کے لئے سعادت جان کر پیچھے کی طرف ٹک گئے، تاکہ ان کا بدن نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر سے مس کر جائے ، اسی حالت میں نبی کریم ﷺ نے زور



سے آواز لگائی، **من یشتری هذا العبد منی** اس غلام کو میرے ہاتھ سے کون خریدے گا، حضرت زاہر رضی اللہ عنہ نے رسول ﷺ کی جب یہ محبت دیکھی تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے ، اور کہا: یا رسول اللہ! اس کالے کلوٹے اور بے قیمت غلام کو کون خریدے گا اور خرید کر کیا کرے گا، رسول ﷺ نے بڑا قیمتی جواب دیا۔ **و لکن لست عند الله بکاسد** اے زاہر کیا بول رہے ہو؟ اللہ کے نزدیک تیری بڑی قیمت ہے، تو سستا نہیں ہے۔

ایک موقع پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے مالدار! ان غرباء کو حقیر نہ سمجھو اور ان سے اپنی نظریں نہ موڑو، تجھے کیا معلوم کہ اللہ تمہیں ان غرباء کی وجہ سے روزی دے رہا ہے۔ فرمایا: **هل تنصرون او ترزقون الابضعفاکم (بخاری)**

آپ ﷺ نے اپنی عملی زندگی میں فقر و فاقہ اختیار کیا، اور اس کے لئے اللہ سے دعائیں کیں ، تاکہ دنیا بھر کے اور قیامت تک کے ضعفا و مساکین کو تسلی رہے کہ ہمارے رسول کریم ﷺ نے بھی ایسی زندگی اختیار فرمائی، آپ ﷺ دعاء فرماتے **اللهم احیینی مسکینا و امتنی مسکینا و احشرنی فی زمرة المساکین** کہ اے اللہ مسکینی کی زندگی عطا فرما اور مسکینی کی موت دے اور قیامت کے دن مجھے مسکینوں کے ساتھ اٹھا، اس دعاء کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ **ماشبع محمد من خبز الشعیر یومین حتی قبض رسول الله** ﷺ (بخاری) رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں کو جو کی روٹی لگاتار دو دن تک میسر نہ ہوسکی، یہاں تک کہ رسول ﷺ دنیا سے پردہ فرما گئے

آپ ﷺ کے آخری دور حیات میں جب فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا تب بھی آپ اپنے حصے غرباء میں تقسیم فرمادیتے آپ نے کسی سائل سے کبھی انکار نہیں فرمایا، ایک حدیث میں ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ سے کبھی کوئی سوال کیا گیا ہو اور آپ نے نا کہہ دیا ہو۔

# خودغرضی

# سماج کے ماتھے کا کلنک

خودغرضی: مفاد پرستی، مطلب پرستی اور دوسروں کے مفاد کو نظر انداز کر کے اپنا الو سیدھا کرنے کا نام ہے۔ یہ ایسی خبیث صفت ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے۔ اور سماجی نظام کو دیمک کی طرح چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیتی ہے، اس سے انسانیت تباہ ہوتی ہے، امن عالم میں دراڑیں پڑتی ہیں، سماجی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور بسا اوقات ملکی وملی مفاد کو بھی زک پہونچتی ہے، چند ٹکوں کے حصول کے لئے ملک کے اہم دستاویز کا سودا کر لینا، کاروبار کو چمکانے کے لئے ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، سودی لین دین، بد دیانتی، فریب دہی، یہ سب خودغرضی کی ہی مختلف قسمیں ہیں، جن کی طرف ہماری توجہ نہیں جاتی اور ہم ان میں گردن تک ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔

آج مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں کیسے پوری ہوں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ خودغرضی کے جراثیم نے جو ہم میں ﴿هل من مزيد﴾ ''کچھ اور'' کی وبا پھیلائی



ہے، اس کو کیسے دور کیا جائے، مرض جتنا پرانا ہوتا ہے، اتنا ہی اس کو دور کرنا مشکل ہوتا ہے، یہ مرض بھی کافی پرانا ہے، رسولوں، ریفارمروں نے اپنے اپنے طور پر اسے دور کرنے کی کوششیں کیں جس سے میں خودغرضی اور دوسری برائیوں کے خلاف انسانی ذہن بیدار ہوا، ایثار وقربانی کے ایسے ایسے واقعات سننے اور دیکھنے کو ملے کہ عقل حیران رہ گئی، لیکن جیسے جیسے ذہن ان تعلیمات سے دور ہوتا گیا، خودغرضی کے جراثیم دل ودماغ میں پھر سے آبسے اور زندگی کا ہر شعبہ اور ہر میدان اس کی گرفت میں آ گیا، گھر سے لیکر بازاروں تک، کھیت کھلیان سے لیکر میدان جنگ تک، خاندن سے لیکر بین الاقوامی انجمنوں اور تنظیموں تک، اسکا دائرہ وسیع ہو گیا، وہ ایران وعراق جنگ ہو یا تامل سنہالیوں کی لڑائی، دو عظیم جنگوں کا سانحہ ہو یا خالصتان کی دم توڑتی تحریک، ہندو پاک کی تقسیم کا سانحہ ہو یا مصر وشام کا تنازعہ، دینی اداروں میں ہنگامہ وسورش ہو یا کارخانوں میں ہڑتالوں کا سلسلہ، سب کی جڑوں میں خودغرضی کی کارفرمائی ہے، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ کچھ لوگ چھوٹے پیمانے پر، انفرادی طور پر اس کا شکار ہیں اور کچھ اجتماعی طور پر قومی پیمانے پر اس کام کو کر رہے ہیں، جس کے نتیجے میں آج ساری دنیا تجارت کی منڈی یا لوہار کی بھٹی بن کر رہ گئی ہے، ساری زمین میدان جنگ ہے، اور امن وشانتی کے بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود چھوٹی اور کمزور قوموں کے لاکھوں بے گناہ انسان اس اجتماعی خودغرضی کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔

یہاں ایک بات یہ بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اپنے مفاد کا تحفظ دوسری ہے اور خودغرضی الگ چیز، اپنے مفاد کا تحفظ اور ضرورت پر نظر رکھنا فطری ہے اور شریعت بھی اسے مذموم اور لائق ملامت نہیں سمجھتی، ہاں خاندان، سماج اور معاشرہ کے تئیں اگر کوئی اپنے فرائض کو اس مفاد کے پیش نظر بھول جائے، اور ملک وملت کی جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں وہ پس پشت چلی جائیں تو یہ لائق ملامت بھی ہے اور مذموم بھی، بالفاظ دیگر یہ کہہ

لیجئے کہ اپنے مفاد کے تحفظ اور خودغرضی میں ایک ایسا فاصلہ ہے، جس کی سرحدی تقسیم شاید ممکن نہیں، اسکی تعیین کام کرنے کے انداز اور طور طریقوں سے ہوسکتی ہے کہ یہ اپنے مفاد کا تحفظ ہے یا محض خودغرضی، شریعت مطہرہ نے شاید اسی لئے اپنے مفاد کے تحفظ کا حق دینے کے باوجود اسے دوسروں کی ضرورتوں پر قربان کردینے کو ایک اچھا عمل قرار دیا ہے، اور اسے کامیابی کے اسباب میں شمار کرایا ہے۔

اسی طرح خودغرضی اور بے غرضی کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے، غرض کے معنی مقصد کے آتے ہیں اور اس معنی میں انسان کا ہر کام کوئی نہ کوئی غرض لئے ہوتا ہے بے غرض کام بے مقصد اور مہمل کہلاتا ہے، خودغرضی کام کو اپنے تک محدود کردیتی ہے اور بے غرضی اسے مہمل بنادیتی ہے انسان کو نہ تو بے مقصد کام کرنا چاہئے اور نہ ہی صرف اپنے مفاد کے چکر میں پڑنا چاہئے۔

یہاں پر اب فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟ یہ مرض انسان میں کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اور پھر اسے کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایک مسلمان اور ابدی دین کے حامل ہونے کی حیثیت سے اس کا جواب ہمیں اسلامی تعلیمات میں تلاش کرنا چاہئے، جہاں تک میری تلاش، جستجو اور میرے فہم کی بات ہے تو میرے نزدیک اس کے چار بڑے اسباب ہیں:

## حُب نفس:

یعنی اپنی محبت، یہ اپنا پن، اپنی ذات، اپنے خاندان اعزہ واقربا اور ملک وملت تک محیط ہے، خودغرضی کے اکثر واقعات اسی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں، اللہ رب العزت نے اسی لئے بار بار اعلان کیا کہ تمہارا اپنا کچھ بھی نہیں ہے، یہ آسمان اور زمین اور اس کے درمیان کی تمام چیزیں صرف اور صرف اللہ کے لئے ہیں، اور اگر تم پوشیدہ یا ظاہر طور پر



اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے پاس اس کا ریکارڈ موجود ہے (بقرہ:۲۸۴) پھر اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ اعلان بھی کروایا کہ میری نمازیں، عبادتیں اور زندگی، موت سب سارے جہاں کے پالنہار کے لئے ہیں (الانعام:۱۶۲) جب معاملہ یہ ہے تو اتنی گنجائش کہاں ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنے مفاد کے لئے کچھ سوچے۔

## حب مال:

خودغرضی کا دوسرا سبب حُبِّ مال ہے، اسے وسیع معنوں میں ہم دنیا کی محبت بھی کہہ سکتے ہیں جب انسان اپنے سے زیادہ مالداروں کو دیکھتا ہے، اچھے مکان، دیدہ زیب لباس، لذیذ اور شہوت انگیز کھانے، شاندار اور پرشوکت سواریوں کو دیکھتا ہے تو وہ دنیا کی ناپائیداری کو بھول کر اس کی آب وتاب کے پیچھے بے تحاشہ دوڑنے لگتا ہے، اور جائز وناجائز کی پرواہ کئے بغیر اسکے حصول کے لئے کوشاں ہوجاتا ہے، اس کی اس ریس سے کتنے کے مفاد کو زک پہونچتی ہے اور کتنوں کا نقصان ہوتا ہے، اسکا احساس اسے نہیں ہوتا، اسے اپنے حلوے مانڈے سے کام ہوتا ہے اور بس، قرآن کریم نے مال ودولت کے سینت سینت کر رکھنے کو اخروی نقصانات کا سبب بتایا (التوبہ:) اور یہ واضح کیا کہ مال کی محبت کوئی اچھی چیز نہیں، بلکہ وہ فتنہ میں مبتلا کرنے والی چیز ہے، اور صحیح یہ ہے کہ مال ودولت کا حصول کسی کو مالدار نہیں بناتا، بلکہ تم سب کے سب محتاج ہو اور غنی تو صرف خدائے بزرگ وبرتر کی ذات ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دولت والوں کو زیادہ غریب اور محتاج قرار دیا، اور فرمایا کہ مسکینوں پر مہربانی کرو، ان کی صحبت اختیار کرو اور ہمیشہ اپنے سے ابتر حال لوگوں کو دیکھو (مسند احمد) اس سے دنیا کی رونق اور تب وتاب، نگاہوں میں کم ہوگی اور خودغرضی کے بجائے ایثار وقربانی کا جذبہ پیدا ہوگا۔

### عزوجاہ کی ہوس:

خودغرضی کا تیسرا سبب عزوجاہ کی ہوس ہے، جو دوسرے تمام اسباب سے زیادہ خطرناک اور نظام عالم کے فساد کا سبب ہے، دراصل ہوتا یہ ہے کہ انسان جب عزوجاہ کی ہوس میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ حرص وہوا کا غلام بن جاتا ہے، وہ بہرحال اس عہدے اور منصب کے حصول کی کوشش کرتا ہے، جس سے اسے اپنی عزت میں اضافہ کی امید ہوتی ہے آج کی سیاست، اور الیکشنی نظام اس کی بدترین مثالیں ہیں، اسلام نے انسانوں کی اس فطرت کے پیش نظر ان تمام لوگوں کو عہدے دینے سے منع کیا جو خود اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس طرح اس نے اس بڑے دروازے کو بند کردیا، جس سے خودغرضی کی جڑوں کو وافر مقدار میں پانی پہنچتا تھا۔

بگڑا معاشرہ: ہم جس معاشرہ میں رہتے ہیں اسکا آوا بگڑا ہوا ہے، اور مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، اس لئے خودغرضی کی وبا متعدی ہوکر پھیلتی جارہی ہے، گو ہمارے رہنماؤں اور مصلحین کو اس کا حددرجہ احساس ہے، لیکن وہ اس کا علاج اسلامی تعلیمات سے الگ ہوکر ڈھونڈتے ہیں، اسلئے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا علاج کیا جائے ورنہ فتنہ فساد، قتل وغارت گری کا وہ بازار گرم ہوگا کہ ساری زمین خون سے لالہ زار ہوجائے گی (جس کی مثالیں اب بھی نایاب نہیں ہیں) اس وقت بند باندھنا اور سد باب کی کوشش کرنا فضول اور بیکار ہوگا۔

آخر میں دعاء ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں ان امراض سے نجات دے تاکہ یہ دنیا پھر سے رہنے کے لائق بن جائے۔

# ایک خط - ایک تأثر

میرے پاس ایک ''متلاشی صاحب'' کا خط آیا، یہ ''متلاشی'' نام تو ہے بڑا عجیب، لیکن عجوبے بھی تو اسی دنیا میں پیش آیا کرتے ہیں، ممکن ہے یہ عرف ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تخلص ہو، میرے لئے تو گمنام کے مترادف ہے نہ جگہ، نہ تاریخ نہ پتہ، جب کسی چیز کا اندراج نہ ہو، ڈاکخانہ کی مہر بھی صاف نہ ہو تو ایسے خطوط گمنام ہی کہے جاتے ہیں، ممکن ہے لکھنے والا سامنے آنے میں یا اپنا نام درج کرنے میں ڈر محسوس ہوا ہو، اتنی بات ضرور ہے کہ مکتوب نگار مخلص ہے، اس کے دل میں ایک آگ لگی ہوئی ہے، ایک بے چینی ہے اور وہ بغیر کسی مخصوص الفاظ وطرز کے اپنی ساری باتیں ایک ساتھ کہہ ڈالنا چاہتا ہے، آپ بھی اس کی باتیں پڑھ لیجئے۔

### شیطان نما انسان:

آج کل پورا معاشرہ دانستہ غلطیاں کرنے پر آمادہ ہے، گویا اسلام سے بغاوت ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہے، رسم ورواج تو تمام مذاہب اور اقوام کی زندگی کے ساتھ ہے، اسے رہنے دیجئے، لیکن آج انسانوں میں جو جذباتیت اور مفاد پرستی کی بیماری در آئی ہے وہ غیروں کے یہاں تو مذموم ہے ہی، روح اسلام کے بھی منافی ہے، عام انسانوں کا کیا

ذکر، مسلمان ہی اسلام کو سرعام رسوا کر رہا ہے، زندگی کے کسی شعبہ کو لے لیجئے وہ آپ کو مسلمان نظر نہیں آئے گا، انسان، انسان کے بیچ شیطان بن کر رہ گیا ہے، اور مسلمان اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

## ماضی سے الگ:

آج لوگ قدامت پسندی اور روایت پسندی کو، ہیچ سمجھتے ہیں اور جدیدیت پر زور دیتے ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ قدامت وروایت میں ہماری تاریخ اور ہمارا ماضی پوشیدہ ہے، جو ہمیں آئینہ دکھاتا ہے، ہم اگر اس آئینہ میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ پاتے ہیں تو یہ ہماری غلطی ہے، نہ کہ آئینہ کا۔

## اسلام ایک جامد مذہب:

آج اسلام ایک جامد مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ آبادی دن دونی رات چوگنی ہوتی جارہی ہے، لیکن اسلام گھٹتا جارہا ہے، اس میں اغیار کی ساری برائیاں داخل ہوگئی ہیں، دوسرے کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہے، اب تو مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی ضرورت پیش آرہی ہے، غیر مسلموں کا کیا ذکر؟ ایسا کیوں ہوا، کبھی سوچا آپ نے؟ اگر سوچا ہے تو اٹھ کھڑے کیوں نہیں ہوتے؟

## ذات پات کی لعنت:

ایک اور بُرائی جو سارے معاشرے میں آگئی ہے، وہ ہے ہندوؤں کی طرح ذات پات کی لعنت، اسٹیج پر تو یہی کہا جاتا ہے کہ سارے مسلمان برابر ہیں، اور اس میں ذات پات کی لعنت کی بنیاد پر تفریق کا تصور نہیں پایا جاتا، پھر یہ شیخ، سید، جلاہے، دھنیا، قصاب، نٹ وغیرہ کی تفریق اور ایک قسم کی بڑائی کا یہ تصور کہاں سے آگیا؟ سوچا



ہے کبھی؟ اگر سوچا ہوگا تو خود کو بھی اس بُرائی سے آزاد نہیں پایا ہوگا۔

## اپنا گریباں اپنا ہاتھ:

اگر حکومت اسلام مخالف قانون بناتی ہے تو ہر طرف سے تحریکیں شروع ہوجاتی ہیں، ہم خود سیکڑوں قانون روز توڑتے ہیں، لیکن ہمارا ہاتھ کبھی اپنے گریبان تک نہیں پہونچتا، ہم انتہائی سکون وطمانیت سے غیر اسلامی زہر آلود پیالہ نوش کر لیتے ہیں اور کرتے آرہے ہیں، مگر احساس تک نہیں ہوتا، ہمیں کہہ لینے دیجئے کہ ہم زندہ ہوکر بھی مردہ پن کے شکار ہیں، ایسا مردہ پن جس نے ہمیں مدہوش اور بدمستی میں مبتلا کر دیا ہے، اگر کوئی نیزہ لیکر جگاتا بھی ہے تو ہم اپنی جان لیکر بھاگنے کیلئے جاگتے ہیں، اسلام کے دفاع اور مقابلے کے لئے نہیں، ایسے بے حس اور مردہ قوم سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

## ہمارے اساتذہ اور ہمارے ادارے:

یوں تو معاشرہ کی اصلاح کے لئے بے شمار ادارے موجود ہیں، لیکن بچوں کا مستقبل والدین کے بعد مدرسہ پر منحصر کرتا ہے، ان اساتذہ پر جو بچوں کی تربیت میں لگے ہوئے ہیں، وہ ان کی تربیت اس انداز میں کریں، جس سے اسلام کی روح ان کے اندر داخل ہوجائے، آج معاملہ یہ ہے کہ اساتذہ اپنے کو صرف سرکار کا غلام سمجھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ اس ذہنیت کو دور کریں، بچوں کو خلوص ومحبت کے ساتھ اسلام کا درس دیں، کیوں کہ یہی قوم کے مستقبل بھی ہیں، اور اساتذہ کی شخصیت وتربیت کے آئینہ دار بھی۔

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقہ سے تراشا جائے

اساتذہ کی حیثیت ایک مصور، ایک فن کار کی ہے، فن انصاف چاہتا ہے، قربانی

چاہتا ہے، خونِ جگر کی، فن کے ساتھ جتنا خلوص برتا جائے، اتنا ہی اعلی ہوتا ہے، ہماری بد قسمتی ہے کہ اس انداز میں کام نہیں ہو رہا ہے، اور آج ؎

مدرسہ علم تو سکھاتا ہے مگر

چھوڑ جاتا ہے خیالات کا بے ربط نظام

آپ لوگ دین کے سپاہی اور وارث انبیاء ہیں، محکوم و مطیع شاگردوں کی بڑی تعداد بھی آپ لوگوں کے پاس ہے، ان کی تربیت اس انداز میں کیوں نہیں کرتے کہ امت مسلمہ کو کھویا ہوا وقار واپس مل جائے، وہ جب مدرسہ سے پڑھ کر نکلیں تو حقیقت میں وہ مرد مومن بن کر نکلیں، وہ عابد شبِ زندہ دار ہی نہیں، میدان کے غازی بھی ہوں، آج جو صورت حال ہے، وہ اس کے برعکس ہے، والدین، اولاد سے اور معاشرہ اپنے افراد سے تو غافل ہے ہی، مدارس اور اساتذہ بھی بے پرواہ اور غیر ذمہ دار سے ہو گئے ہیں۔

### اٹھا میں خانقاہ سے نمناک:

افراد کی شخصیت کی تعمیر میں تصوف اور خانقاہوں کا بھی بڑا مقام رہا ہے، لیکن عام طور پر اب ان خانقاہوں میں تزکیہ اور تصوف کا فقدان ہو گیا ہے، آخر ہم ایسی خانقاہیں کب بنائیں گے جن کو دیکھ کر جنید و شبلی کی خانقاہ یاد آجائے۔

❁❁❁



# زبان و بیان۔ اللہ کی بڑی نعمت

اللہ تعالی نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ہم چاہ کر بھی اس کا شکر ادا نہیں کر سکتے، ساری نعمتیں اپنی جگہ اہم اور ہماری ضروریات کی تکمیل کے لئے بیش قیمت ہیں، انہیں قیمتی نعمتوں میں سے ایک زبان و بیان کی نعمت ہے، اللہ تعالی نے اس کا ذکر خاص طور پر کیا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے زبان و بیان پر قدرت بخشی ہے ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَعَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ زبان، گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا، دنیا کی تمام لذتوں کو محسوس کرنے والا قیمتی آلہ ہے۔ یہ نمکین ہے، یہ میٹھا ہے، یہ کڑوا ہے، یہ تلخ ہے، یہ کسیلا ہے۔ زبان کی پرت پر سب کچھ صاف اور واضح ہو جاتا ہے۔ پھر اسی ٹکڑے سے دنیا کی ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں، اور انسان اپنے خیالات و احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر لوگوں تک پہونچاتا ہے۔ اس کی حلاوت بھی الگ ہوتی ہے اور اس کا زخم بھی عجیب ہوتا ہے۔ ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

جَرَاحَاتُ السِنَانِ لَهَا الْتِيَامِ

وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

یعنی تیر و تلوار کے جو زخم ہیں وہ تو بھر جاتے ہیں لیکن جو زخم زبان کا ہوتا ہے اس کا

بھر پا ناممکن نہیں ہوتا۔وہ زخم دیر پا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے ہمارے آقا ﷺ نے مسلمان کی پہچان یہ بتائی ہے کہ جس کی زبان کے زخم سے لوگ محفوظ رہیں۔

زبان کے صحیح استعمال سے ملکوں کی تقدیر بدل جاتی ہے،سماج میں خیر کا چلن ہوتا ہے،اورلوگ گناہوں سے پرہیز کرنے لگتے ہیں،سارے وعظ ونصائح اور سارے علمی امور اسی کے ذریعہ بیان کے سانچے میں ڈھلتے ہیں،اورلوگوں کے فکر وعمل کو مہمیز کرتے ہیں۔اور جب اسکا رخ خدانخواستہ منکرات کی طرف ہوتا ہے تو جھوٹ،غیبت،چغل خوری، گالی گلوج،طعن وتشنیع تک بات جاپہونچتی ہے۔پھر سماج میں جھگڑوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے۔دلوں کا نفاق بڑھتا ہے،کینہ،کدورت کا بازار گرم ہوتا ہے اور معاملہ خونریزی اور فساد تک جاپہونچتا ہے۔گویا سماج کی بیش تر برائیوں میں اسی کی کارستانی ہوتی ہے۔ دلالی،رشوت خوری،بدعنوانی،کرپشن،سب کا آغاز زبان وبیان سے ہوتا ہے،اور آگے بڑھ کر ان منکرات تک جاپہونچتا ہے۔اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے زبان کی خاص طور پر حفاظت کا حکم دیا اور ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ تم جسم کے دوٹکڑے کی حفاظت کرلو تو میں تمہیں جنت کی بشارت دیتا ہوں،ایک زبان دوسری شرمگاہ۔واقعہ یہ ہے کہ آج جسم کے یہی دونوں ٹکڑے سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں اور عریانی وفحاشی کے سیلاب نے ان دونوں اعضاء کی حفاظت کو مشکل ترین بنادیا ہے۔مشرقی تہذیب واقدار خس وخاشاک کی طرح بہے جارہے ہیں اور ان کی جگہ مغربی اطوار ہمارے گھروں میں ڈیرا ڈالے جارہے ہیں۔

زبان کا بڑا کام بیان ہے۔بیان،دعوت وتبلیغ کا ہو،علمی مباحث کا،سیاسی تقریروں یا روزمرہ کی گفتگو کا،سب اسی زبان سے کئے جاتے ہیں،یہاں مجھے وہ حکایت یاد آرہی ہے کہ ایک بادشاہ نے باورچی کو حکم دیا کہ سب سے اچھی چیز کا سالن تیار کرے، باورچی نے تیار کرکے پیش کردیا،دوسرے دن حکم ہوا کہ سب سے خراب چیز کا سالن بناؤ،



باورچی نے بنا کر پیش کردیا بادشاہ نے تعجب سے کہا کہ تم نے اچھا سالن بھی زبان سے تیار کیا اور خراب سالن بھی زبان ہی سے تیار کیا،یہ کیسے ہوسکتا ہے وہی چیز سب سے اچھی بھی ہو اور وہی چیز سب سے خراب بھی،باورچی نے کہا کہ حضور یہ زبان ہی ہے اگر اس کا استعمال صحیح ہو تو یہ دنیا کی سب سے اچھی چیز ہے اور اگر اس کا استعمال غلط ہو تو یہ دنیا کی سب سے بری چیز ہے جیسا استعمال ہوگا،ویسا ہی حکم لگے گا۔

زبان سے ادا ہونے والے جملے اور الفاظ پر ہی ہماری گفتگو کا انحصار ہے۔یہ گفتگو اگر سلیقہ سے کی جائے اور خلوص ومحبت کی چاشنی اس میں شامل ہو تو یہ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' ہوتی ہے۔علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ایک اور شعر یاد آگیا۔

کون سی بات کب،کہاں،کس طرح کہی جاتی ہے
یہ سلیقہ ہو تو سب بات سنی جاتی ہے

اگر آدمی میں بات کرنے کا سلیقہ ہے تو بے سلیقہ بات بھی لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے۔اسی لئے ڈاکٹر کلیم عاجزؔ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان میں بات کہنے کا سلیقہ ہونا چاہئے:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہئے

آج صورت حال یہ ہے کہ ہمارے یہاں سلیقہ سے بات کہنے والوں کی بڑی کمی ہے۔اس کمی کی وجہ سے ہماری گفتگو میں وہ وزن نہیں پیدا ہو پاتا،جو ہونا چاہئے۔گفتگو کیسے

کی جائے؟ اور زبان و بیان کے استعمال سے انقلاب کیسے ممکن ہے؟ اس کا بہتر نمونہ حضور اکرم ﷺ کی گفتگو میں موجود ہے۔ اسی لئے آپ کو جوامع الکلم کہا گیا۔ آپ ﷺ کی گفتگو موقع کے مناسب اور ایسی باسلیقہ ہوتی کہ انتہائی جذباتی موقعوں پر بھی معاملہ پر قابو پانا ممکن ہوتا۔

اس کی بڑی عمدہ مثال سیرت نبوی ﷺ کا یہ واقعہ ہے کہ جب غزوۂ حنین کے موقع سے آپ ﷺ نے تالیف قلب کے لئے مکہ والوں میں مال غنیمت تقسیم کر دیا اور انصار کے حصے میں کچھ نہیں آیا تو چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ آپ ﷺ نے مکہ والوں سے اپنی قرابت کا خیال رکھتے ہوئے انہیں نوازا، شدہ شدہ یہ بات آقائے نامدار ﷺ تک پہونچ گئی، آپ نے صحابہؓ کرام کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم کہہ سکتے ہو کہ میں بے گھر تھا تو تم نے پناہ دی، مجھ پر لوگوں نے حملہ کیا تو تم دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، تم نے اپنی جان کی بازی لگادی، تمہارا یہ کہنا حق بجانب ہے لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعہ تمہیں ہدایت دی، تم محتاج تھے، اللہ نے ہمارے ذریعہ تمہیں غنی بنایا، صحابہؓ سب کی تائید کرتے رہے اور بالآخر آقا ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں کہ مکہ والے مال لے جائیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے رسول کو لے جاؤ، سب کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور ساری غلط فہمی دور ہوگئی، بات کو سلیقہ سے رکھنے کی یہ ایک مثال ہے۔ سیرت نبوی ﷺ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

بیان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلوب ایسا اختیار کیا جائے کہ سننے والوں پر اس کا خوش گوار اثر ہو، گلزار دبستاں میں ایک بادشاہ کا ذکر کیا ہے کہ جس نے یہ خواب دیکھا تھا کہ اس کے سارے دانت گر گئے ہیں، خواب کی تعبیر کے لئے نجومی کو بلایا گیا اس نے کہا کہ حضور! تعبیر یہ ہے کہ آپ کے سارے اعزہ واقربا آپ کی زندگی میں مر جائیں گے، بادشاہ



نے کہا: کم بخت کو بند کرو، کیا خراب تعبیر بیان کی ہے، بھلا میرا بیٹا، میری بیوی، میرا بھائی، اور میرے اپنے پیارے سب دنیا سے چلے جائیں گے اور میں ان کا جنازہ اٹھانے کے لئے زندہ رہوں گا، غصہ کم ہوا تو بادشاہ نے دوسرے نجومی کو بلایا، اور اس سے بھی یہی خواب بیان کیا، اس نے کہا کہ مبارک، سلامت، بڑا اچھا خواب ہے، دس بار مبارک سلامت کے بعد اس نے کہا کہ حضور! اللہ آپ کی عمر پورے خاندان میں سب سے دراز کریں گے، بادشاہ نے خوش ہوکر موتیوں سے مالا مال کر دیا، نتیجہ کے اعتبار سے خواب کی دونوں تعبیر میں فرق نہیں ہے۔ بس الفاظ کا الٹ پھیر ہے، ایک تعبیر منفی سوچ کی غماز ہے، اور دوسری مثبت کی نمائندہ، ایک میں موت کی بات ہے تو دوسرے میں زندگی کی؛ لیکن سامع پر دونوں کے اثرات الگ الگ پڑتے ہیں۔ گفتگو میں مثبت اثر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بات نرمی سے کی جائے، تلخی، ترش روئی اور غیر مہذب جملوں کے استعمال سے بچا جائے، بات کرتے وقت حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے، اللہ رب العزت نے اپنے وقت کے سب سے اچھے انسان حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو اس وقت کے سب سے بُرے انسان فرعون کے پاس بھیجا تو نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا ﴿فَقُوْ لَا لَهٗ قَوْلًا لَيِّنًا﴾

اسی طرح جو کہا جارہا ہے وہ بھی اہم ہو، بکواس، طنز و تعریض جیسی گفتگو سے گو وقتی طور پر لوگ محظوظ ہوتے ہیں، لیکن اسکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، اسی لئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ اس شخص سے اچھی بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور خود بھی اچھا عمل کرے، اسی طرح اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ دوسرے مذاہب والے کو برا بھلا نہ کہو، اس لئے کہ پھر وہ اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنے زبان و بیان پر قابو رکھیں، تقریر و تحریر گفتگو اور مکالمے میں مثبت اسلوب اختیار کریں، منفی اور دلوں کو ٹھیس پہونچانے والی باتوں سے گریز کریں تو

سماج کی بہت ساری برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی ،اور ہم ایک ایسے سماج کی تشکیل کر سکیں گے جو جھگڑے، کینہ کدورت، بغض وعناد سے پاک سماج ہوگا۔

موضوع کی مناسبت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ان جملوں کو بھی یاد رکھنا چاہئے فرمایا: ''لوگ جو کہتے ہیں، کہنے دو۔لیکن اپنی زبان کو آلودہ نہ کرو، کبھی سخت وسنگلاخ الفاظ سے قومی معاملات حل نہیں ہوتے ۔کسی کو گالی دینے کا مطلب یہ ہے کہ گالی سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے ،ایک موقع سے فرمایا: زبان حد درجہ محتاط ہونی چاہئے ، کچھ اس طرح کہ وقار و تمکنت اور سنجیدگی ومتانت آگے بڑھ کر ان کی بلائیں لینے لگیں''۔

# نہی عن المنکر

ایک سرکاری دفتر جس کا پورا ماحول بدعنوانی، کرپشن اور رشوت خوری سے آلودہ ہو چکا تھا،اس میں ایک افسر تھے، نام تھا ابوالمکارم ،انتہائی دیانت دار، ایماندار اور اصول پسند، اپنی دنیا میں مگن رہنے والے، نماز کا اہتمام، قرآن کریم کی تلاوت، غلط فائل کی واپسی، اور ہر قسم کی بے اصولی سے اجتناب، گویا دفتر کے پورے ماحول میں وہ کسی طرح فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔ بدعنوانی اور کرپشن کے اس ماحول میں بے چارے ابوالمکارم پر کیا کچھ گزر رہی ہوگی، دوسرا کون جان سکتا ہے۔مجلس میں کبھی تذکرہ ہوتا تو ان کی تعریف بھی کی جاتی، ان کے صلاح وتقوی کو مثال میں پیش کیا جاتا اور کہا جاتا کہ اسے کہتے ہیں ''قعر دریا'' میں ''تختہ بند'' ہو کر اس طرح رہنا کہ ''دامن تر'' نہ ہو۔لیکن اندر سے کوئی پسند نہ کرتا، سب انہیں کباب کی ہڈی سمجھتے۔

ایک دن میں اس دفتر کے نیم پلیٹ (Name Plaet) کو پڑھ رہا تھا تو دیکھا کہ کسی نے ان کے نام کے آخری میم کو کھرچ کر صاف کر دیا تھا، گناہ گاروں کی اس دنیا میں اس عمل کے بعد ابوالمکارم، کم از کم لکھنے کی حد تک ''ابوالمکار'' ہو گئے تھے۔

''ابوالمکارم'' سے ''ابوالمکار'' تک کا یہ سفر صرف میم کے مٹا دینے کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس صورت حال کو بتاتا ہے کہ سماج میں جب منکرات کا مزاج بن جاتا ہے۔عام لوگ اس رنگ میں رنگ جاتے ہیں، تو سماج کا وہ فرد یا طبقہ جو منکرات سے الگ رہتا ہے،

اپنے کو سماجی بائیکاٹ کی پوزیشن میں پاتا ہے، گاؤں میں شادی کی تقریب میں ڈسکو ڈانس، بھگڑا ناچ، فحش قسم کے فلمی گانے کا شور ہے، ایسے میں وہ شخص جس نے اپنے کو اس ماحول سے بچا رکھا ہے، ایک چہار دیواری میں محصور کمرہ میں بند ہو جاتا ہے، سارے لوگ عیش وطرب کی مجلس میں شریک ہیں اور یہ بے چارہ الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہے، نماز کی اذان ہو گئی، دو چار لوگ مسجد گئے، بقیہ تاش کھیلنے میں لگے ہوئے ہیں، دوکانوں پر بیٹھ کر غیبت کر رہے ہیں، کسی کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے، کسی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اور بقیہ لوگ ٹھٹھے لگا رہے ہیں۔ یہ ماحول کسی ایک دفتر، ایک گاؤں یا شہر کا نہیں ہے، یہاں تو ہر نگر ہر ڈگر ایک سا حال ہے۔

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ بے راہ روی یک بیک سماج کا جز نہیں بنی ہے، بلکہ اس کے پیچھے برسوں اور سالوں کی کوتاہیاں ہیں، جو نہی عن المنکر کے سلسلے میں کی گئی ہیں۔ جب سماج میں ایسا ماحول بن جاتا ہے تو حضرت لوط علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کو بھی گاؤں اور علاقہ نہیں بخشا اور اعلان کر دیتا ہے کہ أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَتَطَهَّرُوْنَ (قرآن) آل لوط کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ لوگ ستھرے رہنا چاہتے ہیں یعنی اپنے کو بڑا پاک وصاف بنانا چاہتے ہیں تو ہم ناپاکوں میں ان کا کیا کام ہے۔

اور اگر نکالنا ممکن نہیں ہوتا تو اس پاک وصاف آدمی میں اتنے کیڑے نکالے جاتے ہیں کہ اپنا عیب چھپ جائے، نیز صالح اور منکرات کے عادی لوگ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں اور کچھ نہیں ممکن ہوا تو ایسا نام ہی دیدیتے ہیں جو برائی کی طرف مشیر ہو، حالانکہ قرآن کریم میں صاف صاف کہا گیا کہ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الِايْمَانِ ایمان کے بعد فاسقانہ نام رکھنا بُری بات ہے، لیکن سماج اس کی پرواہ نہیں کرتا، خیال ہوتا تو منکرات ہی سے تائب نہ ہو جاتا۔

اس حد تک جب سماج چلا جائے تو غضب الٰہی متوجہ ہوتا ہے اور قوم کو اپنے کئے کی سزا ملتی ہے۔ اس کی زد میں کچھ ایسے لوگ اور ایسا خاندان بھی آجاتا ہے جو اصلاً سماج کی



بے راہ روی کا شریک وسہیم نہیں ہوتا، قرآن کریم میں واضح طور پر فرمایا گیا کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً اس فساد سے بچتے رہو جو صرف ظالموں پر ہی نہیں پڑے گا۔

اس کا سیدھا اور صاف مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے برائیوں کو دیکھ کر مداہنت کی پالیسی اپنائی، نہ تو تذکیر کا کام کیا، نہ ہی برائی سے روکنے کی جرأت دکھائی اور نہ اظہار نفرت ہی کر سکا، خدائی عذاب میں یہ شخص بھی مبتلا ہوگا، اور اس کا جرم صرف اتنا ہوگا کہ اللہ کی زمین پر اس نے گناہ ہوتے دیکھا اور اس پر نکیر کی، کسی درجے میں ہمت نہیں جٹا سکا، اور اس نیک آدمی کے چہرے پر شکن تک نہیں آئی۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمثیلی حدیث کافی ہے جس میں آپ نے دو منزلہ جہاز کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کچھ لوگ اوپر کی منزل میں ہیں اور کچھ نیچے کی منزل میں، پانی اوپر کی منزل سے لانا ہوتا ہے اب اگر نیچے والا سوچے کہ بار بار اوپر جانے سے ہر دو کو تکلیف ہوتی ہے کیوں نہ نیچے کی سطح میں ہی ایک سوراخ کر لیا جائے تاکہ پانی بآسانی حاصل ہو، ایسے میں اگر اوپر والے نے اس احمقانہ حرکت سے نیچے والے کو نہ روکا اور اس زعم میں رہ گئے کہ ہم تو اوپر ہیں، نیچے والا جو چاہے کرے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں اس میں غرقاب ہو جائیں گے۔ یعنی ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے'' والا معاملہ ہوگا۔

بعض لوگ نہی عن المنکر کی کوتاہیوں کو چھپانے کیلئے قرآن کریم کی دوسری آیت يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ کا سہارا لیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے، تم راہ پر رہو تو جو کوئی بھی گمراہ ہو، تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ حالانکہ اس آیت سے نہی عن المنکر جیسے فریضہ سے غفلت کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ کیوں کہ سارے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اِهْتَدَيْتُمْ یعنی سیدھی

راہ کا مطلب، ایمان کے ساتھ نہی عن المنکر کی ادائیگی بھی ہے، ہاں! اگر روکنے کی کوشش کی گئی، پھر بھی لوگ برائی سے نہیں رُکے تو یہ شخص معذور سمجھا جائے گا، حضرت تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت سے یہ سمجھ لینا کہ ''جب ایک شخص اپنا روزہ نماز ٹھیک کر لے تو امر بالمعروف چھوڑ دینے سے اسے کوئی مضرت نہیں ہوتی، سخت نادانی کی بات ہے، لفظ اہتداء امر المعروف وغیرہ تمام وظائف وہدایت کو شامل ہے''۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موقع ومحل دیکھے بغیر تذکیر شروع کر دی جائے اور ہر آدمی نہی عن المنکر زور وشور سے کرنے لگے بلکہ شریعت میں نہی عن المنکر کے مدارج اور طریقے ہیں، جس کی وضاحت آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے مَنْ رَأیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی تم میں منکرات کو دیکھے اور قوت سے روکنے کی استطاعت ہو تو قوت سے روک دے۔ اور اگر قوت سے نہ روک سکتا ہے تو زبان سے کہے۔ اور اگر اس کی بھی سکت نہیں ہے تو دل سے برا مانے۔ امام غزالیؒ نے اس حدیث پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ہدایت سماج کے تین طبقوں کے لئے ہے، ایک امراء اور حکام ہیں، سلطنتوں کے مالک ہیں اور سارے معاملات میں ان کا حکم چلتا ہے، ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ طاقت وقوت سے منکرات کو روکنے کی جدوجہد کریں تاکہ سماج کو برائیوں سے پاک کیا جا سکے۔

دوسرا طبقہ علماء وصلحاء کا ہے، ان لوگوں کے پاس قوت تنفیذ تو نہیں ہوتی؛ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی زبانوں میں ایسی تاثیر عطا کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کے دلوں پر دستک دیتے ہیں اور لوگ ان کے احکام کی تعمیل اور ان کی ہدایات پر عمل کرنا فخر سمجھتے ہیں، ایسے لوگوں کو یہ ہدایت ہے کہ سماج کے منکرات پر زبان سے نکیر کریں۔

تیسرا طبقہ عوام الناس کا ہے جن کو اللہ نے نہ تو حکومت دی ہے اور نہ زبان ہوشمند، نہ ان کے پاس طاقت ہے اور نہ ہی وہ کچھ کہنے کی ہمت جٹا پاتے ہیں، ایسے لوگ اس کے



لیے دل سے برا ماننا، ہدایت پر قائم رہنے کے لئے کافی ہے۔ یہ ایمان کا کمزور اور کمتر درجہ ہے، لیکن عضو ضعیف کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ منکرات کو دیکھتا ہے اور دل میں کڑھ کر رہ جاتا ہے، وہ سخت ذہنی ٹینشن میں رہتا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا تو اپنی بے بسی اور بے کسی پر آنسو بہاتا ہے اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا، کچھ لوگ خوب منکرات کی مجلسوں میں دعوتیں اڑاتے ہیں، اور سارے پروگرام میں شریک رہتے ہیں، پوچھئے کہ آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تو بڑی معصومیت سے کہتے ہیں کہ ہم دل سے برا ماننے والوں میں ہیں، یہ گناہ پر ڈھٹائی ہے، دل سے برا ماننے والا مجلس کا شریک نہیں ہوا کرتا جب دل میں کڑھن ہو، اور اللہ کی نافرمانی دیکھ دیکھ کر قلب وجگر تپ رہا ہو، ایسے میں مجلسوں میں شریک ہونے کا خیال ہی نہیں آسکتا۔ ہر روز وتر کی نماز میں جب ہم دعاء قنوت میں وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَفْجُرُکَ پڑھتے ہیں، تو اللہ کے سامنے اقرار کرتے ہیں کہ ہم گناہگاروں سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ اور پھر اس وعدہ کو بھول کر نہ صرف گناہ گاروں کی مجلس کی زینت بڑھاتے ہیں، بلکہ خود گناہوں کے ارتکاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے دست وبازو بننے سے بھی گریز نہیں کرتے، جنہوں نے پوری دنیا میں عیاشی وفحاشی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

مختصر یہ کہ آج سماج جس طرح منکرات میں جکڑا ہوا ہے اور یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے، ضرورت ہے کہ ''امر بالمعروف'' کے لئے قائم جماعت کے طرز پر ''نہی عن المنکر'' کی بھی ایک جماعت ہو، صرف ''امر بالمعروف'' کی تبلیغ کافی نہیں ہے۔ اگر یہ کافی ہوتا تو امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کا تذکرہ اہتمام کے ساتھ نہ ہوتا، یہ اہتمام بتاتا ہے کہ ''نہی عن المنکر'' بھی ہماری ملی اور دعوتی ذمہ داری ہے۔ یہ امت خیر امت اس لیے ہے کہ یہ لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتی ہے اور برائی سے روکتی ہے۔ برائی سے روکنے کے عمل کو چھوڑ کر ہم خیر امت کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

❁❁❁

# چند سماجی برائیاں

اسلام نے اچھے اخلاق اور اچھی صفتوں کے پیدا کرنے، اسے زندگی میں برتنے، اور بڑے مشکل حالات میں بھی اس پر سختی سے کاربند رہنے پر زور دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ میں صالح قدروں کو رواج دیا جائے، صفات خبیثہ اور اعمال رذیلہ سے پرہیز کیا جائے، دوستی صرف اللہ کے لیے ہو، اور معیاری ہو اور دشمنی بھی اللہ کے لئے ہو، اور اس میں بھی اخلاق کریمانہ کا پاس وخیال رکھا جائے۔

لیکن آج کا انسان پابندیوں کو پسند نہیں کرتا، وہ اخلاق حسنہ سے آزاد زندگی گزارنے کا عادی اور خوگر ہو گیا ہے، ہمارا سماج برائیوں کی وجہ سے کراہ رہا ہے، چوٹ خود پر پڑتی ہے تو آدمی بلبلا جاتا ہے، دوسروں سے فائدہ اٹھانا ہو تو حلال وحرام کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی، ضرورت ہے کہ ان سماجی برائیوں کی نشاندہی کی جائے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کے مضر اثرات لوگوں کے سامنے رکھے جائیں، یہ نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی بھی ہے اور سماج کے غلط سمت کو صحیح اور مثبت رخ دینے کی ایک کوشش بھی، انہی احساس کے ساتھ یہ مضمون سپرد قلم کیا گیا، اللہ کرے یہ بانگ رحیل، کارواں کے دل میں احساس زیاں پیدا کر سکے کہ یہی صالح معاشرہ کی تشکیل کے لیے پہلا زینہ ہے۔



## خدا بیزاری:

سماج میں جو سب سے بڑی بُرائی ہے وہ خدا بیزاری کی ہے، خدا بیزاری کا مطلب بے لگام ہو جانا ہے، جب ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، فرشتوں، آسمانی کتابوں، رسولوں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اچھی بُری تقدیر کی تصدیق کرتے ہیں، اور اسے من جانب اللہ مانتے ہیں تو ہمیں اس کے احکام پر چلنا بھی ضروری ہے، ایمانیات کا جامد اقرار دوسرے کسی مذہب میں کافی ہو تو ہو اسلام میں کافی نہیں ہے، اسلام کا مطالبہ ہے کہ ہمارے اعضاء وجوارح ہماری فکر، ہماری سوچ، ہمارا طرز عمل، ہمارے معاملات، ہماری معاشرت اور ہماری عبادات کو بھی خدا کے بنائے سانچے میں ڈھلا ہونا چاہئے، ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے مذہب کی رسی کو چھوڑ دیا ہے اور خدا بیزار سماج کے فرد بن گئے، اس لئے ہمارے اخلاق وعادات، خود ساختہ مذہب کے تابع ہو گئے، آباء واجداد کا ہر عمل ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ بن گیا، حالانکہ ہمارے لئے اسوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہے اور ہمیں اس اچھے نمونے کی پیروی کرنی تھی ہم نے اسی نمونہ کو چھوڑ کر بہت سارے افراد کی زندگی کو نمونہ بنالیا ہے، اسی میں کامیابی ڈھونڈنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ہر محاذ پر ناکام ونامراد ہو گئے، سکون وچین ہماری زندگی سے چھن گیا، اور ہم پریشانی اور مشکلات کی اس دلدل میں جا پڑے، جس سے نکلنے کی کوشش کا خیال بھی ہمارے ذہن سے نکل گیا ہے یا نکلتا جا رہا ہے۔

## منافقت:

دل میں کچھ اور زبان پر کچھ، اسلام کی نظر میں منافقت ہے۔ منافق آستین کا سانپ ہوتا ہے، جس سے بچنا بہت مشکل ہے، وہ معاشرہ بلکہ اپنی سوچ کے اعتبار سے خدا کو بھی دھوکہ دیتا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنے کو دھوکہ دیتا ہے اور اللہ رب العزت نے اعلان کر

دیا ہے کہ ایسے لوگ جہنم کے آخری درجہ میں اپنے اس مذموم حرکت کی سزا بھگتیں گے۔

ہمارے سماج میں یہ بیماری عام ہے، بیش تر لوگ حقیقتاً جیسے ہیں، ویسا نظر نہیں آتے ہیں اور جیسا نظر آتے ہیں ویسا وہ اندر سے نہیں ہوتے، منافقت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ہم کسی کو برا سمجھیں لیکن اس کے جاہ ومنصب، مال ودولت کی وجہ سے اس کی تعریف کرتے رہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار خصلتیں اگر کسی میں جمع ہو جائیں تو وہ منافق ہے اور اگر چاروں میں سے ایک پائی جائے تو یہ منافقت کی علامت ہے وہ چار خصلتیں یہ ہیں، امانت میں خیانت کرے، بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جھگڑا کرے تو بدزبانی پر اتر آئے، ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا: منافق کی تین نشانی ہے، جب بات کہے تو جھوٹ کہے، وعدہ کرے تو پھر جائے، اور جب معاہدہ کرے تو دھوکہ دیدے، گرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو، اللہ رب العزت نے یہ بھی اعلان کیا کہ منافق جھوٹے ہیں۔

## جھوٹ:

انسان کی ساری برائیوں میں جھوٹ سب سے قابل نفرت اور قابل مذمت ہے، یہ أُمُّ الأَمْرَاض اور أُمُّ الْمَعْصِيَة ہے، اس کے بطن سے گناہ جنم لیتے ہیں، اسی قرآن و احادیث میں اس پر سخت نکیر کی گئی ہے، قرآن کریم میں کَاذِبِیْن پر اللہ کی لعنت کا ذکر ہے۔

بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ جھوٹ گناہ پر مائل کرتا ہے اور گناہ دوزخ میں لے جانے والی چیز ہے، آدمی جھوٹ بولتے بولتے اللہ کے یہاں کذاب یعنی بڑا دروغ گو لکھا جاتا ہے، حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہی کافی ہے سنی سنائی باتیں لوگوں سے کہتا پھرے، ایک روایت میں ہے کہ جس نے میری کوئی حدیث نقل کی اور سمجھ رہا ہے کہ یہ غلط ہے، وہ



دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے یعنی ایک جھوٹا تو وہ ہے کہ جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا یعنی روایت گڑھی اور ایک وہ جو اس کو نقل کرتا پھر رہا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن کے اندر بہت سی خرابیاں پائی جاسکتی ہیں، سوائے خیانت اور جھوٹ کے، مؤطا امام مالک کی ایک روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

ان ارشادات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر حال میں جھوٹ سے بچا جائے، بچوں کو بہلانے پھسلانے کے لیے بھی جھوٹ نہ بولا جائے، بچوں کو جھوٹ کے نقصانات بتائے جائیں، اور ان کے ذہن میں بیٹھا دیا جائے کہ جھوٹ سے آدمی ہلاکت میں مبتلا ہوتا ہے، مزاح اور مذاق بھی جھوٹ پر مبنی نہ ہوں، مدح اور تعریف میں بھی مبالغہ سے پرہیز کیا جائے، اس لئے کہ یہ بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے، جھوٹ لکھنے سے بھی گریز کیا جائے، تجارت، سیاست، معاملات سب کی بنیادمیں صدق وصفا کو رواج دیا جائے، اور پورے سماج سے جھوٹ کو اکھاڑ پھینکا جائے۔

## تکبر:

قابل تعریف صفات میں اپنے کو دوسروں سے بڑھ کر سمجھنا اور اپنے علاوہ دوسروں کو حقیر وذلیل سمجھنا، تکبر ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبر حق کا انکار اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

قرآن کریم میں اس کے نقصانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے دور ہی رکھوں گا، جو تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی حق نہیں ہے دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ جب بندہ تکبر کرتا ہے اور حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو

اللہ تعالیٰ اس کو گراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تو ذلیل ہو، پھر خود کو بڑا سمجھتا ہے اور لوگوں کے نزدیک ذلیل ہوتا ہے، یہاں تک کہ لوگ اسے سُوَر سے بھی ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔

تکبر کے پیٹ سے ہی حب جاہ، انانیت، ضد، ہٹ دھرمی، حسد اور اس جیسے دوسرے امراض پیدا ہوتے ہیں، اور اشرف المخلوقات انسان جسمانی، مالی اور اخلاقی اعتبار سے تباہ ہو جاتا ہے۔

کبر سے ہلکی ایک چیز خود پسندی اور عجب ہے، یہ بھی انسانی زندگی کے لئے کبر کی طرح مضر اور نقصان دہ ہے، غزوۂ حنین میں جو پریشانی مسلمانوں کو اٹھانی پڑی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، یہ عجب ہی کا ثمرہ تھا۔

تکبر کا ایک طریقہ اظہار تواضع بھی ہے یعنی یہ سوچ کر تواضع اختیار کرنا کہ لوگ متواضع اور منکسر المزاج کہیں گے، پروفیسر لطف الرحمٰن نے ایک شعر میں اس کی وضاحت کی ہے ؎

عجیب طرز ادا ہے یہ خاکساری بھی　　قریب سے جو دیکھا تو خدا نکلا

البتہ کسی کی ظاہری وضع وقطع کو دیکھ کر متکبر کا حکم لگانا مناسب نہیں ہے، کیوں کہ تکبر پوشیدہ اور دل سے تعلق رکھنے والی بیماری ہے اور ظاہری علامتوں سے اس کا پتہ لگانا مشکل امر ہے، یہی وجہ ہے کہ تکبر کے کفر سے اشد اور زنا سے بدتر ہونے کے باوجود اس پر دنیا میں کوئی شرعی حد مقرر نہیں کی گئی اور صرف اسے آخرت پر چھوڑ دیا گیا۔

## ریاکاری:

کوئی بھی نیک کام اس غرض سے کرنا کہ لوگ سنیں اور شہرت ہو، یہ ریاکاری ہے، اس کی وجہ سے سارے اعمال صالحہ قیامت میں بیکار ہو جائیں گے، نہ علم کام آئے گا، نہ مال، نہ اللہ کی راہ میں قربانی، نہ غریبوں کو کھانا کھلانا اور نہ دوسرے عبادات، حتی کہ وہ



نماز جو ریا اور دکھاوے کے لئے پڑھی گئی ہو، انسان کی تباہی و بربادی کا سبب بن جائے گا، قرآن کریم میں ایسے نمازیوں کے لیے ''فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْن'' فرمایا گیا ہے۔

قرآن کریم میں اس شخص کی مثال جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کیلئے خرچ کرتا ہے، اس چٹان سے دی گئی ہے، جس پر مٹی پڑی ہوئی ہے، پھر زور کی بارش ہوئی تو سب کچھ بہ گیا، اور کچھ ہاتھ نہیں آیا، ریا کے ساتھ کام کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آخرت کے اعتبار سے کچھ ہاتھ نہیں آتا، بلکہ اس کے بدلے میں کچھ عذاب کا ہی سامنا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ اوپر ریاکار نمازیوں کے لیے ﴿ویل﴾ کا ذکر کیا گیا۔

بخاری ومسلم کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت میں مشہور کر کے رسوا کرے گا، اور جو اللہ کے لئے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو جزا دیں گے، ایک حدیث قدسی ہے کہ جو کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی کو میرا ساتھی بنائے تو میں اسے اور اس کے ساجھے کام کو چھوڑ دیتا ہوں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ریا اعمال کو گھن کی طرح چاٹ کر کھوکھلا بلکہ ختم کر دیتا ہے، اس بیماری کے جراثیم اگر نفس میں گھس گئے تو یہ ریاکار کو جہنم میں دھکیلنے کے لئے کافی ہے، اسی لئے اسلام میں ریا اور اخلاص سے عاری عمل پر سخت تنقید کی گئی ہے، جسکا تقاضہ ہے کہ طلباء و اساتذہ، علماء، دانشور، سرکاری اہل کار، مصلحین، ریفارمر اور ہر اعمال خیر کرنے والا، اپنی نیت کو اللہ کے لئے خالص کرے، اس لیے کہ دین خالص اللہ کا حق ہے ﴿زمر: ۳﴾ اور اعمال کا دارومدار نیت ہی پر ہے، نیت کی درستگی اور ریا سے اجتناب کے باوجود اگر عمل خیر کی شہرت ہو اور لوگ تعریف کریں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ مؤمن کے لیے پیشگی خوشخبری ہے۔

❁ ❁ ❁

# روشن خیالی، اعتدال پسندی اور اسلام

اسلام کی تعلیمات اور قرآن واحادیث کے احکام وہدایات کا سرسری طور پر بھی مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں روشن خیالی بھی ہے اور اعتدال پسندی بھی، اس سے الگ ہوکر جو کچھ کیا جائے گا، اس میں اعتدال پسندی بھی نہیں ہوگی اور روشن خیالی بھی نہیں، ہوسکتا ہے بعض لوگ بغیر سمجھے بوجھے ان الفاظ کا استعمال کررہے ہوں اور انہیں اسلام مخالف کام میں ہی اعتدال پسندی نظر آتا ہو، اور اسلام کی حمایت میں اٹھنے والی ہر آواز دہشت گردی کے مترادف ہو۔ اسی پس منظر میں بش کے دورۂ ہند کے موقع سے احتجاج کو مغرب کی اندھی مخالفت کہہ کر ہلکا کرنے کی نازیبا حرکت کی گئی۔ حالاں کہ افغانستان اور عراق کے لوگوں کے قتل عام کے ذمہ دار کے خلاف احتجاج، مغرب کی اندھی مخالفت نہیں، اس ظلم وجور کے خلاف احتجاج تھا، جو ہر صالح سماج کیلئے ضروری ہے، ورنہ ظالم اور ظلم پر جری ہوگا اور مظلوم کی چیخ وپکار اقتدار اور طاقت کے گلیاروں میں سنانے کا حوصلہ ماند پڑ جائے گا اور اس کی کوکھ سے تشدد اور تاریک خیالی جنم لے گی۔

اسلام میں خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا کی جو بات کہی گئی ہے وہ اعتدال پسندی کا سلوگن اور موٹو ہے۔ چلنے پھرنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، بولنے لکھنے، سب میں اسے اپنانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اعتدال کا مطلب میانہ روی ہے۔ قرآن کریم میں فضول خرچی



کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے ﴿ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنَ ﴾ اور ﴿ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ ﴾ کہہ کر افراط کے مزاج کو قابو کیا گیا اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ ﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلىٰ عُنُقِكَ ﴾ اپنے ہاتھوں کو گردن سے مت لپیٹ لو، یعنی بخالت پر مت اتر آؤ، یہ تفریط سے اجتناب کی تلقین ہے۔ اس کے بیچ کا جو راستہ ہے وہ اعتدال ہے۔ اور وہ یہ کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کیا جائے بغیر افراط وتفریط کے۔

اسی طرح زمین پر اکڑ کر چلنے سے منع کیا ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ اور نرم روی کو رحمٰن کے بندوں کی صفت قرار دیا ﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا ﴾ اور ﴿ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ ﴾ چال میں میانہ روی اختیار کرو ﴿ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴾ کہہ کر زور سے بولنے کی ممانعت کی گئی اور ﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾ کہہ کر اعتدال کیساتھ بات کرنے کا طریقہ بتایا، ادب وشاعری میں اختر شماری کو ناپسندیدہ قرار دیا، قول وعمل میں تضاد سے منع کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ایمان وعمل صالح، ذکر اللہ اور دفاع کے لئے اس کا استعمال مستحسن ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ روشن خیالی کا لفظ میڈیا آج جن معنوں میں استعمال کررہا ہے اس کی حیثیت بس ایک خوش کن نعرہ کی ہے اور اس کے پیچھے مغرب کا یہ ذہن کام کررہا ہے کہ ہر سمت سے جدت اور اباحت پسندی کو راہ دی جائے، تعلیم، لباس، تہذیب وثقافت، کلچر سب میں اس کے مظاہر کھلے آنکھوں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اگر روشن خیالی یہی ہے کہ عورتیں غیر مردوں کی باہوں میں جھولتی رہیں، آزادی کے نام پر انہیں رقاصہ بنادیا جائے، جسم سے کپڑے اتار لئے جائیں، خاندان کا وجود پارہ پارہ ہوکر رہ جائے، بوڑھے والدین کو اولڈ

ہاؤس بھیج دیا جائے، ماں بہنوں کی عزتیں محفوظ نہ رہیں اور جوع البطن کے جذبہ سے ملکوں کو تاراج کیا جائے۔ ہم جنسی کو قانونی تحفظ حاصل ہو اور جسم فروشی کو پیشہ کا درجہ دیا جائے تو یہ روشن خیالی مغرب کو مبارک ہو اور میں سو بار یہ کہنے کو تیار ہوں کہ ایسی روشن خیالی سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اسلام اس پر سو بار لعنتیں بھیجتا ہے۔

اسلام کی روشن خیالی یہ ہے کہ دوسرے کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو ﴿ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ اسلام کی روشن خیالی یہ ہے کہ اگر کسی جان کو ناحق قتل کر دیا تو اس نے انسانیت کا قتل کر دیا اور اگر کسی کی جان بچا لیا تو انسانیت کو بچا لیا ﴿ مَنْ قَتَلَ نَفْسَاً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَا هَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً ﴾ اسلام کی روشن خیالی یہ ہے کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کا احترام اپنی بہو بیٹیوں کی طرح کرو، ان پر نگاہ مت ڈالو اور اپنی نگاہیں جھکی رکھو، شرمگاہ کی حفاظت کرو، ﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ﴾ اسلام کی روشن خیالی یہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر بچوں کو قتل مت کرو ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْ أَوْلَادَكُم خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ﴾ اور یہ کہ رزق کی ذمہ داری اللہ کی ہے، جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ ایک سوچنے والا دماغ اور کام کرنے والا ہاتھ لے کر آتا ہے۔ یتامیٰ اور ضعفاء کے مال کی طرف نگاہ مت ڈالو، سارے لوگ برابر ہیں اور ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہونی چاہئے۔ یہ وہ روشن خیالی ہے جس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔

جس روشن خیالی کا میں نے اوپر کی سطروں میں تذکرہ کیا ہے یہ ہماری ضرورت ہے۔ یہ روشن خیالی مذہبی اقدار پر عمل اور اسلام کی معتدل عملی شکلوں کو اپنا کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے سماج افراط وتفریط اور بہت سارے نواہی سے بچ سکتا ہے۔ اسے اپنا



کر ایک مثالی سماج کی تشکیل کی جا سکتی ہے، جس میں خیر کا عنصر غالب ہوگا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ دنیا جس روشن خیالی کے پیچھے پاگل ہے، اسے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ روشن خیالی اور اعتدال پسندی نہیں بلکہ یہ صالح سماجی قدروں کے خلاف بغاوت ہے۔ اس زاویۂ نظر کی تبدیلی سے سیاسی، سماجی ہر سطح پر اس کے مثبت اثرات پڑیں گے۔ اور یہ دنیا جسے طاقتوروں نے اپنے ظلم کا میدان بنا رکھا ہے، امن وسکون، صلح وآشتی، باہمی رواداری اور محبت والفت کے ایسے مناظر پیش کرے گی کہ یہی دنیا جنت نشاں بن جائے گی۔

❁❁❁

# زکوٰۃ: اسلام کا اہم رکن

اسلام کا نظامِ معیشت عدل وانصاف پر مبنی ایسا کامل ومکمل نظام ہے، جس کی نظیر دنیا کے کسی قدیم وجدید نظام میں نہیں ملتی۔ یہ نظام خشک وبے جان نظریات پر مبنی نہیں؛ بلکہ اس کی جڑیں دل وجذبات سے لے کر عمل تک اور معاشرے کی نچلی سطح سے لے کر اوپری سطح تک پیوست ہیں، جس میں جبر واستبداد اور ظلم وجور کی کوئی گنجائش نہیں، اسلام پہلے انسانی زندگی پر احکم الحاکمین کا دبدبہ قائم کرتا ہے اور اس کے احسانات یاد دلاتا ہے، اور انسانی ذہنوں میں یہ راسخ کرتا ہے کہ تمہارے پاس جو مال ودولت ہے وہ سب رب العالمین کا عطیہ ہے، یہ مال درحقیقت اللہ تعالی کا ہے جو بطور امانت تمہارے سپرد کیا گیا: ﴿وآتو هم من مال الله الذی اٰتكم﴾ (النور:۳۳) اور اللہ کے اس مال میں سے انہیں دو جو اس نے تمہیں عطا کیا۔ لیکن ساتھ ہی اسلام انسانوں کو اپنے مال ومتاع کی مالکیت سے کمیونزم کی طرح محروم بھی نہیں کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے مال ودولت کا انتساب بار بار انسان کی طرف کیا ہے تاکہ انسان کی خوداعتمادی اور جذبۂ مسابقت نہ صرف یہ کہ محفوظ رہے بلکہ پروان چڑھتا رہے، ارشاد باری ہے: ﴿الذین ینفقون أموالهم فی سبیل الله﴾ (البقرہ:۲۶۷) جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔



## اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت:

اسلام کے عادلانہ نظام معیشت کے بہت سارے حصے ہیں لیکن ان میں اہم ترین اور محوری شعبہ زکوٰۃ ہے یہ اسلام کا تیسرا رکن اور اہم ترین فریضہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ محض اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ ۸۲ مقامات پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے، ﴿أقِیْمُوْ االصَّلوٰةَ وآتُو الزَّكوٰةَ﴾ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان میں ﴿یُؤتُوْنَ الزَّكوٰةَ﴾ بار بار آیا ہے۔ اس موضوع پر احادیث حدتواتر تک پہنچ چکی ہیں، اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ زکوٰۃ نماز کے ساتھ لازم وملزوم ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ دین کا خلاصہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی ہے، پہلے کا عنوان نماز ہے اور دوسرے کا زکوٰۃ۔ ان کی بھرپور انداز میں تکمیل کے بعد ہی اقامت دین کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ ایک روایت میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کی نماز بھی مقبول نہیں ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ﴿لا یقبل الله تعالى صلوٰة رجل لا یؤدی الزكوٰة حتى یجمعهما فإن الله تعالى قد جمعهما فلا تفرقوا بینهما (کنزالعمال:۲۵/۳) کہ اللہ تعالی اس شخص کی نماز قبول نہیں کرتا جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، یہاں تک کہ وہ ان دونوں کو جمع کرے یعنی نماز اور زکوٰۃ دونوں ادا کرے اس لئے کہ اللہ تعالی نے نماز اور زکوٰۃ کو ایک ساتھ بیان فرمایا ہے۔

## زکوٰۃ کا مقصد:

زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اپنے نفس کو بخل، خودغرضی، انانیت، فقراء کی حق تلفی اور قلب کی قساوت سے پاک وصاف کر کے اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرے۔

اللہ تعالی نے فرمایا:﴿ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (توبہ: ۱۰۳) آپ ان کے مالوں سے صدقہ لے لیجئے آپ اس کے ذریعہ انہیں پاک وصاف کردیں گے۔ اسکا مقصد یہ بھی ہے کہ فقراء وضعفاء اور حاجت مندوں کی حاجت رسی کی جائے، جس کی وجہ سے پاکی ونورانیت اور خیر وبرکت کا ظہور ہوگا۔﴿ مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضاً حَسَناً فَیُضَاعِفُهُ لَهُ اَضْعَافاً کَثِیْرَةً﴾ (البقرۃ:۲۴۵) کون شخص ہے جو اللہ کے لئے قرض حسن (زکوٰۃ یا صدقات دیتا ہے تا کہ اللہ تعالی اس کو اس شخص کے لئے بہت زیادہ بڑھائے یہ بھی مقصد ہے کہ ہر شخص کے پاس اپنی لازمی ضروریات کی تکمیل کے لئے کچھ نہ کچھ مال ہو۔ معاشرے میں کوئی بھوکا یا ننگا نہ رہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے﴿إن اللہ فرض علی الأغنیاء فی أموالهم بقدر ما یکفی فقرائهم وإن جاعوا وعرووجهدو فیمنع الأغنیاء وحق علی اللہ أن یحاسبهم یوم القیٰمة ویعذبهم علیه﴾ ۔کہ اللہ تعالی نے مالدار لوگوں پر انکے مال میں اس انداز سے زکوٰۃ فرض قرار دیا ہے جو فقیروں کے لئے کافی ہوجائے، اب اگر فقراء، بھوکے، ننگے رہتے ہیں یا تکلیف میں رہتے ہیں تو یہ مالدار لوگوں کے زکوٰۃ نہیں ادا کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالی کا حق ہے کہ وہ قیامت کے دن ان سے محاسبہ کرے اور زکوٰۃ نہیں ادا کرنے پر عذاب دے۔

## زکوٰۃ میں اجتماعی روح کی کارفرمائی:

زکوٰۃ کے جو مقاصد ومصالح اور اس کے فوائد ذکر کئے گئے، ان کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی وصولیابی اور تقسیم کیلئے ایک جماعتی نظام موجود ہو، اس لئے کہ فرضیت زکوٰۃ کے احکام ومصالح کی عمارت اسی پر کھڑی ہے۔ جس طرح نماز، روزہ اور حج میں اجتماعیت کی روح کارفرما ہے کہ نماز کو جماعت کیساتھ ادا کرنا ہے، روزہ کی



فرضیت پوری دنیا کے مسلمانوں پر ایک ہی مہینے میں ہے، مناسک حج کی ادائیگی بھیڑ واز دہام، دشواری وپریشانی کے باوجود چند مخصوص ایام ہی میں کرنی ہے، ٹھیک اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک اہم ترین عبادت ہے اور اس کیلئے بھی اسلام نے ایک اجتماعی طریقہ کار مقرر کیا ہے کہ امیر کے تحت بیت المال قائم ہو، وہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے اور مستحقین تک باعزت طریقے پر پہنچائے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:﴿ خُذْ مِنْ اَمْوالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُ هُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِها﴾ (التوبہ:۱۰۳) کہ اے پیغمبر آپ مسلمانوں کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے اس کے ذریعہ ان کو پاک اور مزکی بنائیے۔ یہ آیت کریمہ واضح طور پر اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ صاحب نصاب مالداروں سے زکوٰۃ وصول کیجئے یعنی کہ زکوٰۃ کی وصولی امام کے ذریعہ ہو امام وامیر کے تحت حسب مصالح زکوٰۃ کی رقم مصارف زکوٰۃ میں صرف ہو اور ''خذ'' میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے وہ ''خطاب مواجہہ'' ہے چنانچہ علامہ نوویؒ شارح مسلم تحریر فرماتے ہیں:﴿وخطاب مواجهة للنبی صلی اللہ علیه وسلم وهو جمیع امته فی المراد سواء﴾ (نووی:۱/۳۸) اور خذ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو خطاب ہے وہ ''خطاب مواجہہ'' ہے اسلئے حکم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت دونوں شامل ہیں۔

## تقسیم زکوٰۃ میں اجتماعیت کے فوائد:

زکوٰۃ کے اجتماعی نظام سے زکوٰۃ کی وصولی زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہو سکے گی۔ اور زیادہ سے زیادہ ضرورت مند افراد کا تعاون ممکن ہو سکے گا۔ لوگوں کا تعاون انکی ضرورت کے لحاظ سے ہوگا۔ محتاج اور ضرورت مند لوگ سوال کرنے کی ذلت سے بچ سکیں گے۔ زکوٰۃ کی رقم کوڑیوں میں بٹنے کے بجائے حسب ضرورت لوگوں کو ایک جگہ سے مل

جائے گی ان لوگوں تک بھی زکوٰۃ پہنچ جائے گی جن کی زبانیں حیاوخودداری کیوجہ سے بند رہتی ہیں، انفرادی زکوٰۃ کی مقدار، تقسیم کے بعد اتنی کم ہوجاتی ہے کہ وہ کسی غریب شخص کو اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں کرسکتی، زکوٰۃ کا اجتماعی نظام اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اور گدا گری کا خاتمہ کرتا ہے۔

## زکوٰۃ کا اجتماعی نظام عہد نبوت وخلفاء راشدین میں:

حجۃ الاسلام ابوبکر جصاص رازیؒ اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھتے ہیں: ''خُذْمِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً'' کی آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی کا حق امام کو ہے اور بلا شبہ جن پر زکوٰۃ فرض ہے اگر وہ خود مساکین کو دے دیں گے تو یہ جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ زکوٰۃ کی وصولی کا حق امام کے لئے ثابت وقائم ہے۔ لہذا صاحب زکوٰۃ کو امام کے اس حق کو ساقط کرنے کا کوئی اختیار نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کی زکوٰۃ کے لئے عاملین کو بھیجا کرتے تھے اور حکم فرماتے تھے کہ انکی زکوٰۃ ان کی جگہ پر جا کر لیا کریں اور یہی حکم پھلوں کی زکوٰۃ کا ہے بقیہ رہ گئی سونے، چاندی، دراہم ودنانیر کی زکوٰۃ تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خدمت میں داخل کی جاتی تھی۔ پھر حضرت عثمان غنیؓ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا کہ یہ زکوٰۃ کا مہینہ ہے، جس پر قرض ہو وہ اپنے قرض کو ادا کرے پھر باقی مال کی زکوٰۃ ادا کرے، حضرت عثمان غنیؓ نے ارباب مال کو اختیار دیا کہ وہ زکوٰۃ مسکینوں کو ادا کریں۔ (احکام القرآن: ۱۵۵/۳) علامہ ابن الہمام حنفیؒ لکھتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں خلیفہ اس پر قائم رہے۔ جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا اور لوگوں کا تغیر ظاہر ہونے لگا تو انہوں نے خیال کیا کہ لوگوں کے پوشیدہ مالوں کا خفیہ طریقہ سے پتہ لگانا مناسب نہیں، اس لئے انہوں نے اس مال کی ادائیگی ان کے مالکان کے سپرد کردی اور صحابہ نے بھی اس مسئلہ



میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ اس کی حیثیت امام کے حق وصول کو باقاعدہ ساقط کر دینے اور گزشتہ حکم کو منسوخ کردینے کی نہیں تھی۔ (فتح القدیر: ۳۱۱/۱)

## بعد کی صدیوں میں نظام زکوٰۃ میں کوتاہی اور اس کا انجام:

اس تفصیل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زکوٰۃ کا مزاج اور شرعی تقاضہ ہے کہ وہ بیت المال میں جمع کی جائے اور ان خلفاء وامراء کے سپرد کی جائے جو اس کے منتظم وذمہ دار ہیں۔ چنانچہ اسلامی خلافت اپنے درجات کے تفاوت کے باوجود برابر زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا عمل انجام دیتی رہی۔ خلافت عباسیہ کے آخری دور تک یہ صورت حال برقرار رہی۔ بالآخر آہستہ آہستہ آنے والی مختلف حکومتوں نے اس نظام کی پابندی کو ختم کردیا اس کے نتیجے میں تمام اسلامی ملکوں میں سخت انتشار برپا ہوا، مسلمان شریعت اسلامی کی برکتوں سے محروم ہوتے چلے گئے اور اسی کی سزا ہے کہ آج انکو ظالمانہ سرمایہ داری، پُرفریب سوشلزم اور انتہا پسندانہ وغیر متوازن کمیونزم کا مزا چکھنا پڑ رہا ہے۔

## تقسیم زکوٰۃ کے لئے اجتماعی نظام کی بحالی:

یہ ایک بڑی سچائی ہے کہ اسلام کا کامل تصور بغیر جماعت اور امارت کے ممکن نہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں ایک مسلمان کے لیے اجتماعیت سے محرومی اور انتشار میں مبتلا رہنا بہت بڑا نقصان اور دینی ودنیوی خسران کا سبب ہے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا: ﴿لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة إلا بامارة﴾ جب جماعت اور امارت قائم ہوگی تو ان شاء اللہ پوری امت پر اللہ کی خاص رحمت کا نزول ہوگا ارشاد نبوی ہے: يد الله على الجماعة۔

لہذا وہ علاقے اور خطے جہاں اسلامی نظام امارت قائم نہیں، وہاں کے مسلمانوں

کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ نظام امارت قائم کریں اور اپنے میں سے کسی ایک لائق شخص کو امیر منتخب کرلیں، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے لکھا ہے: ﴿اما فی بلاد علیها ولا ة الکفار فیجوز للمسلمین إقامة الجمعة والأعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب وال مسلم﴾۔

جب امارت شرعیہ قائم ہوجائے جیسا کہ الحمدللہ صوبہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ وغیرہ میں قائم ہے۔ تو اس کے تحت فوری طور پر بیت المال کا شعبہ قائم کیا جائے، جس میں کام کرنے والے عاملین کی ایک بڑی تعداد ہو۔ وہ لوگوں سے زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ مثلاً عشر وغیرہ وصول کریں اور بیت المال کے ذریعہ اسے اسکے صحیح مصارف میں خرچ کیا جائے۔

## زکوٰۃ کی تقسیم کہاں کی جائے:

زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے؟ اور زکوٰۃ کی تقسیم کن لوگوں کے مابین ہونی چاہئے اس کیلئے خود اللہ تعالی نے سورہ برأۃ میں واضح حکم نازل فرمایا: ارشاد ہے ﴿ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبِهِمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَرِيْضَةً مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ (توبہ:۶۰) صدقات واجبہ تو صرف غریبوں، محتاجوں اور ان کارکنوں کے لئے ہیں جو اس کام پر مقرر ہیں، نیز ان کا جنکی دلجوئی مقصود ہے، اور صدقات کو صرف کیا جائے گردنوں کے چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرضہ ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی امداد میں یہ فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ بڑا علم والا، بڑا حکمت والا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ صدقات کرنے والے کو اختیار نہیں کہ اپنی پسندیدگی سے اس کیلئے مصرف تجویز کرے اور اس میں خرچ کرے، بلکہ اللہ تعالی نے اسکے لئے خود مصرف مقرر فرمادیا ہے اور طے فرمادیا ہے کہ ان مدات کے سوا ان کو دوسری جگہ خرچ نہیں کیا



جاسکتا ہے۔ مذکورہ آیت میں کل آٹھ مصارف بیان ہوئے، یہ منصوص مصارف، زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ دائمی ہیں۔ البتہ مؤلفۃ القلوب کے بارے میں اکثر علماء، ائمہ اور فقہاء کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت اور غلبہ کیوجہ سے اب ان کے حصہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس سلسلے میں قاضی ابوبکر ابن العربیؒ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ اگر اسلام کو غلبہ واقتدار حاصل ہو تو ضرورت نہیں، لیکن اگر اس کی ضرورت محسوس کی جائے تو ان کو اسی طرح دینا چاہئے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے۔ قاضی ابوبکر کی اس رائے کو علامہ مناظر احسن گیلانیؒ، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور دیگر علماء نے پسند فرمایا۔

## مدارس کے چندہ کا مسئلہ۔ حل کیا ہے؟:

مدارس اسلامیہ میں زیر تعلیم طلبہ بالاتفاق زکوٰۃ کا مصرف ہیں، بعض علماء انہیں ابن سبیل میں اور بعض انہیں فی سبیل اللہ یا فقراء ومساکین میں داخل مانتے ہیں۔ ان طلبہ کے لئے ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مدارس اسلامیہ کی طرف سے زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام ہوتا ہے، اور زکوٰۃ کی وصولی کا کام مدرسہ کے اساتذہ، سفراء اور مبلغین انجام دیتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کا نوے فیصد حصہ مدارس پر خرچ ہوتا ہے اور مدارس کا اتنا عظیم ڈھانچہ زکوٰۃ وصدقات کی رقم پر ہی اصلاً قائم ہے۔ اور بلاشبہ یہ مدارس دین کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مدارس کا منتشر طور پر زکوٰۃ وصول کرنا اور اس کے لئے نت نئے طریقے اختیار کرنا، کمیشن وغیرہ پر چندہ کروانا، شریعت اسلامیہ کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہذا جن صوبوں میں امارت شرعیہ کا نظام قائم ہے اور اس کے تحت بیت المال ہے۔ ان صوبوں کے مدارس کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنا انسلاک بیت المال سے کریں اگر یہ ممکن نہ ہو تو امیر شریعت کی طرف سے انہیں باضابطہ رقم کی وصولی کی اجازت دی جائے اور وہ اس کی آمد وخرچ کا حساب بیت المال میں

داخل کریں اگر ایسی صورت ہوجائے تو زکوٰۃ وصول کرنے والے سفراء ومحصلین ''عاملین علیھا'' کے مصرف میں داخل ہوسکتے ہیں۔لیکن کمیشن پر چندہ کرنا بہرصورت ناجائز رہے گا۔ جن صوبوں میں نظام امارت قائم نہیں ہے، ان میں اس نظام کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جب تک یہ نظام قائم نہ ہوجائے ارباب مدارس اس علاقے کے اربابِ حل وعقد کے مشورے سے اس کام کو کرسکتے ہیں، یا اس کے لئے کوئی انجمن، تنظیم وغیرہ بنائی جاسکتی ہے جو صالح وبہترین افراد پر مشتمل ہو اور زکوٰۃ کو اس کے صحیح مصرف میں خرچ کرسکے۔آج مختلف ناموں سے غیر معتبر تنظیموں کے قیام کا ایک فیشن سا چل پڑا ہے، جو اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کر کے امراء سے رقمیں حاصل کرتے ہیں اور من مانے طور پر جائز وناجائز مصارف میں اسے خرچ کرتے ہیں۔ایسی انجمن، تنظیم اور فاؤنڈیشن کی قطعا حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔ ورنہ زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کی جو روح ہے وہ ختم ہوکر رہ جائے گی اور وہ انفرادی نظام کی طرح ہوجائے گا۔





# اصلاح معاشرہ کے لئے میڈیا کا استعمال

آج ہم جس معاشرہ میں سانس لے رہے ہیں، یہ اخلاقی انحطاط، بے عملی، انارکی، لاقانونیت، رشوت، سودخوری، بدعنوانی اوراس جیسے بہت سارے امراض میں مبتلا ہے، سماج سے ان برائیوں کو دور کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بجا طور پر اصلاح معاشرہ کی تحریک چلا رکھی ہے، پورے ملک میں اس کے اثرات محسوس بھی کئے جارہے ہیں۔ یہ کام مدارس اسلامیہ کے پھیلے ہوئے نظام کے تحت بھی ہورہا ہے اور علماء کرام کے خطابات بھی اس میں کلی طور پر ممد ومعاون بن رہے ہیں۔کام آگے بڑھ رہا ہے اور اسے بڑھنا چاہئے، لیکن اسکے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اب بھی ہم نے بہت سارے دلوں پر دستک نہیں دی ہے اور بہت سارے قلوب کو نہیں جھنجھوڑا ہے۔ بہت سارے علاقوں میں ہماری آواز اب تک نہیں پہونچی ہے اور ہم اپنے محدود وسائل اور رجال کار کی کمی کی وجہ سے چاہ کر بھی ان تک نہیں پہونچے ہیں اور شاید موجودہ طریقۂ کار میں ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔

اگر ہم اس کام کو بڑے پیمانہ پر کرنا چاہتے ہیں تو دو اہم کام کرنے ہوں گے، ایک تو یہ کہ داعی خود اسلام کا اشتہار ہوجائے، اسکا اخلاق، کردار، اعمال، فکر اور سوچ سب اسلام کے سانچے میں اس طرح ڈھل جائے کہ دیکھنے والا اس کو مثال اور نمونہ بنا سکے اور یہ ممکن ہو کہ ہم کسی کو کہہ سکیں کہ یہ مجسم اسلام کھڑا ہوا ہے۔آج واقعہ یہ ہے کہ ہم جس چیز

کی دعوت دیتے ہیں، ہمارا اپنا عمل اس کی نفی کرتا رہتا ہے۔ داعی کی دعوت کو اس کا کردار جھٹلا دے تو دعوت کا کام مؤثر نہیں ہوسکتا۔ قرون اولی میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ یہی تھی کہ جو مسلمان جہاں تھا، اسلام کا اشتہار بن گیا تھا۔

دوسرا کام یہ ہے کہ ہم اس کام کے لئے ذرائع ابلاغ اور میڈیا کا استعمال کریں تاکہ تھوڑی توانائی صرف کرکے بڑے حلقوں تک اپنی بات پہونچا سکیں، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے لئے سب جگہ پہونچنا ممکن نہیں ہے، لیکن اگر ہماری آواز میڈیا کے ذریعہ پھیلتی ہے تو یہ آواز گھر گھر پہونچے گی، جس سے سماج کی اصلاح کے دروازے کھلیں گے، لیکن یہ کام بہت آسان نہیں ہے۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنا ہے اور ذرا سی چوک سے مثبت کے بجائے منفی اثرات پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بڑوں نے بڑے پیمانے پر اب تک اس کا استعمال نہیں کیا ہے۔

جب ہم میڈیا کی بات کرتے ہیں تو ہمارا ذہن پرنٹ میڈیا اور الکٹرونک میڈیا دونوں کی طرف جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں جو کچھ آرہا ہے۔ اس میں اخبارات کو چھوڑ دیا جائے تو اصلاح معاشرہ سے متعلق کچھ نہیں ہوتا، بلکہ معاشرہ کا جو فساد ہے اسے ہی نمایاں کرکے شائع کیا جاتا ہے، کیوں کہ اس کی حیثیت ''گرم خبر'' کی ہوتی ہے، ہر اخبار چاہتا ہے کہ یہ گرم خبر وہ اپنے قاری کو فراہم کرے، قاری کا ذوق بھی ایسا ہی ہوگیا ہے کہ تعمیری خبروں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی، قاری کے اسی ذوق کی وجہ سے جرائم اور جنسی رسائل سے بازار بھرے پڑے ہیں اور شاید پرنٹ میڈیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا یہی موضوع ہے۔ ایسے میں قاری کی سوچ اور فکر کو کس طرح ان خبروں اور آرٹیکل کی طرف موڑا جائے جو سماج سے بگاڑ کو ختم کرسکتے ہیں یہ ایک مشکل کام ہے۔ لیکن ناممکن ہرگز نہیں ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اخبارات اور رسائل کے مدیران سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا جائے تاکہ وہ ان خبروں کو



نمایاں کریں، جو سماج میں صالح معاشرہ کی تشکیل میں معاون ہوں، ایسے آرٹیکل اور مضامین کے لئے کچھ حصے مختص کئے جائیں جو اس موضوع پر لکھے گئے ہوں، ان واقعات پر بھی توجہ دی جائے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ سماج میں ابھی صالح قدروں کا فقدان نہیں ہوا ہے، اس قسم کے سارے مضامین کا اسلوب ایسا رکھا جائے کہ مطالعہ کنندہ کو یہ مضامین محض وعظ نہ معلوم ہوں، قاری کی دلچسپی اس سے بن جائے اور وہ شوق و ذوق سے پڑھا جائے۔ اس سلسلے میں تمثیلی انداز بھی مؤثر معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے مثبت نتائج اخذ کرنے والا اسلوب اس کام کے لئے ہر اعتبار سے مفید اور مناسب ہے، ادب اور شاعری کی ہیئت، فورم اور اسلوب میں بھی یہ کام اچھے انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ جس زمانہ میں توبۃ النصوح، مراۃ العروس، ابن الوقت وغیرہ لکھی گئیں، اس وقت اس نے بڑے حلقے کو متاثر کیا تھا۔ حالؔی کی شاعری کو چاہے آپ ''زوال پذیر قوم کا مرثیہ'' کہیں لیکن اس سے جو کچھ کرنے، آگے بڑھنے اور صلاحیت کو صالحیت کے ساتھ پروان چڑھانے کا حوصلہ ملتا ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ادب، شاعری کے حوالہ سے اگر ہم اپنی بات رکھیں تو پرنٹ میڈیا کے لئے اسے چھاپنا بھی آسان ہوگا اور پڑھنے والوں اور اثر قبول کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہوگی ''ادب اسلامی'' کا عنوان اگر گراں بار ہو تو بھی موضوع میں اس کی رعایت کرلی جائے کہ وہ اعلی اخلاقی قدروں کے فروغ کا ذریعہ بن جائے۔ اس طرح ہم پرنٹ میڈیا کا وسیع پیمانے پر استعمال کرسکیں گے، اور اس کے مثبت اور مفید نتائج سامنے آئیں گے۔

اصلاح معاشرہ کیلئے الیکٹرونک میڈیا کے استعمال میں پرنٹ میڈیا سے زیادہ دشواری ہے۔ کیوں کہ الیکٹرونک میڈیا کا کوئی پروگرام ایسا نہیں ہوتا، جس میں مغرب کی ''روشن خیالی'' کی جھلک نہ ہو، ناظرین اسی کے عادی ہوگئے ہیں اور دوسرا کوئی پروگرام جو انتہائی سنجیدہ اور لہو ولعب سے پاک ہو، ناظرین کی نظر میں ''بور'' ہوتا ہے۔ جب پہلے

مرحلہ میں بوریت گھس جائے تو نہ افادہ آسان ہوتا ہے اور نہ استفادہ۔ ایسے میں ہمیں اپنی الگ راہ سوچنی ہوگی، جو شریعت کے نقطۂ نظر کے مطابق ہو اور جو دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے، اس کے لئے الیکٹرونک میڈیا کے ماہرین کو اس کام سے جوڑنا ہوگا، جو منصوبہ بند انداز میں اس اہم کام کو کر سکیں، وہ اصلاح معاشرہ کے بلند بانگ نعرے اور دعوے کے ساتھ میدان میں نہ آئیں بلکہ پروگرام کا موضوع، ترتیب اور پیش کش اس انداز کا ہو کہ وہ ''از دل خیزد بر دل خیرریزد'' کے صحیح مصداق بن جائیں، جو لوگ اس عنوان سے بدکتے رہے ہیں وہ بھی غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہوں۔

ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کوئی نعرہ دے کر لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں تو ایک بڑا طبقہ اس نعرے کی وجہ سے پہلے مرحلہ میں ہی ہم سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم بغیر نعرے کے کھڑے ہوں تو بہت لوگ اس کی طرف تجسس کے جذبے سے متوجہ ہوں گے۔ اور ہم اپنی بات ان تک پہونچانے میں کامیاب ہوں گے۔ اس کے لئے اپنے ٹی وی چینل کا قیام سب سے اچھی چیز ہے۔ لیکن یہ بڑا پروجکیٹ ہے، اور خرچیلا کام ہے، جب تک ہم اس پر قابو نہیں پاتے، ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ بعض چینل کے کچھ اوقات خرید کر اپنے انداز میں اپنی چیزیں پیش کریں، پھر جب یہ پروگرام مقبول ہو جائے تو مستقل چینل کے قیام کے بارے میں سوچا جائے۔ دوسروں کے بہت سارے چینل ہیں، اپنے بھی کچھ لوگ کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کیو، ٹی، وی میں غالب عنصر خیر کا ہی رہتا ہے۔ البتہ اس میں مونیٹرنگ کی ضرورت ہے، بغیر مونیٹرنگ کے اس کام میں اندیشے اور خدشات بہت ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے کسی بھی اقدام سے پہلے علماء اور الیکٹرونک میڈیا کے ماہرین کی ایک میٹنگ کی جائے اور اس میں کام کی شکلوں پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔

❁❁❁



# تعلیم کو تجارت نہ بنائیے

کیسا عجیب ہے یہ عنوان؟ اور کتنا عجیب ہے اس پر خامہ فرسائی کرنا، وہ کام جو کار نبوت میں شامل ہے اور جس کے لئے اجر خداوندی کا وعدہ ہے اور جس کے لئے انبیاء نے بار بار ﴿اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ﴾ کا اعلان کیا، اسی کام کو بزنس اور تجارت بنا دینا اور اسکی پاکیزگی کو حصول منفعت کا ذریعہ بنانا، اس پورے کام کی توہین کے مترادف ہے۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

علماء کو چھوڑئے، ان کا تو مشن ہی جہالت کی تاریکی میں علم وحکمت کے چراغ روشن کرنا تھا، دوسرے لوگ بھی اسے روٹی روزی کا علم کہنے پر چراغ پا ہو جاتے تھے، پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں کہ جب معاشیات کے باوا آدم، اسمتھ نے اکنومکس کو ''بریڈ اینڈ بٹر'' کا علم کہا تھا تو علمی دنیا میں بھونچال آ گیا تھا اور آج تک اس تعریف کی مذمت اسی نام پر کی جاتی ہے۔

اب نہ اسمتھ رہے اور نہ ان کی مذمت کرنے والے، کاش وہ ہوتے تو کھلی آنکھوں دیکھ لیتے کہ آج سارے علوم کی ڈور ''بریڈ اینڈ بٹر'' سے ہی جوڑ دی گئی ہے۔ اور مدارس اسلامیہ تک کی تعلیم میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ پڑھ کر یہ کیا کریں گے؟ یعنی ان کی روٹی کا کیا ہوگا؟ مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ عصری اداروں میں طلبہ کی جو بھیڑ ہے وہ تشنگان علوم کی نہیں، ان لوگوں کی ہے جنہیں بتایا گیا ہے کہ اس تعلیم سے روٹی کے دو ٹکڑے اور شوربہ کی ایک پیالی مل سکتی ہے۔

اس سوچ نے جن اداروں کو پیدا کیا ان کی بڑی بڑی فیس نے تعلیم کے کام کو مشکل تر کر دیا، وہی پڑھ رہے ہیں، جن کی تجوریاں بھری ہوئی ہیں اور وہ ان اداروں کی موٹی فیس ادا کر

سکتے ہیں۔رہ گئے وہ غریب جن کے نام پر ادارے قائم کئے گئے تھے اور زکوۃ وخیرات تک کی رقم لیکر شرعی وغیر شرعی انداز میں بلڈنگیں کھڑی کی گئیں، ان کے لئے آج بھی ''دلی دور ہے''

تعلیم کو تجارت بنا دینے کا سب سے بڑا نقصان غریب لوگوں کو ہی ہوا ہے، جو پیٹ کی آگ بجھانے اور دو وقت کی روٹی کے لئے دوڑ لگا رہے ہیں، وہ اس موٹی فیس کی ادائیگی سے قاصر رہتے ہیں اور ان کے لیے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو زری کے کارخانوں اور ہوٹل میں بھیج دینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ہمارے دینی مکاتب جو کل بھی اور آج بھی تعلیم کے فروغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور وہ مدارس جو آج بھی غریب طلبہ کی کفالت کر کے انہیں علم سے آشنا کرتے ہیں ان کے غیر معیاری، قدامت پسند ہونے کا ایسا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ امراء کے بچوں نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔یہی وجہ ہے کہ خیرات وزکوۃ اور دوسرے مدات سے وہ اس کی بھرپور مدد کرتے ہیں لیکن اپنے بچے کو وہ ان اداروں میں دینے سے کتراتے ہیں، وہ مذہبی تعلیم سے محبت نہیں کرتے، اسے ضروری بھی نہیں سمجھتے، بس ثواب کے لئے دیتے، دلاتے رہتے ہیں۔اگر انہیں مذہبی تعلیم سے محبت ہوتی اور اس کی ضرورت کو سمجھتے تو اپنے چشم وچراغ کو اس دولت سے کیوں محروم رکھتے۔اس پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں لوگوں کا اعتماد بھی ان پر کم ہونے لگا اور لوگوں نے کنونٹ وغیرہ کی طرف معیار اور جدت کے نام پر دوڑ لگائی۔لڑکوں پر بستہ کا بوجھ بڑھا اور گارجین پر اخراجات کا، اور بات وہیں کی وہیں رہی، بلکہ کہنا چاہئے کہ جس کام کے لئے ہم لڑکوں کو تیار کر رہے تھے، کوچنگ کرا رہے تھے، اس میں کامیابی کا تناسب گھٹتا چلا گیا۔

اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے چھ سے پندرہ سال کے بچوں میں پندرہ فی صد وہ ہیں جنہیں کسی تعلیمی ادارہ کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا، وجہ؟ معاشی بدحالی اور حصول تعلیم کے لئے روزمرہ گراں ہوتی فیس ہے، مدارس کا رخ تو اس لئے نہیں ہوتا کہ اتنے وقت میں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بچہ کچھ کما لے گا پھر اس لیے کہ ان مدارس کے تعلیمی معیار کے بارے میں ہمارا ذہن صاف نہیں ہے، اس ذہنی پراگندگی کے نتیجے میں سچر کمیشن کی



رپورٹ کے مطابق چار فی صد بچے ہی ادھر کا رخ کرتے ہیں پھر ان میں بھی کتنے درمیان میں ہی ڈراپ آؤٹ کر جاتے ہیں۔اس ساری صورت حال سے نمٹنے کے لئے کچھ ادارے مفت تعلیم اور کچھ اسکالرشپ، وظائف وغیرہ کا نظم کرتے ہیں لیکن ان اداروں میں شفافیت کی کمی ہوتی ہے، ان میں اقرباء نوازی کی جڑیں اتنی مضبوط اور پختہ ہوتی ہیں کہ ''گھر'' سے باہر جانے والے وظائف محدود تر ہو جاتے ہیں، اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔مستثنیات سب جگہ ہوتے ہیں، یہاں بھی ہیں لیکن عمومی حال یہی ہے جس کا ذکر کیا گیا۔

ایسے تعلیمی اداروں سے جو طلبہ فارغ ہوتے ہیں ان کے ذہن کی اٹھان معاشی بنیادوں پر ہوتی ہے، ان کے ذہن میں مادی ترقی کا ایک مینار ہوتا ہے اور اس بلندی تک پہنچنے کے لئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوتے ہیں، سماج میں رشوت کے بڑھتے رواج کی یہ بھی ایک وجہ ہے، لینے والا اپنی معاشی خواہشات کی تکمیل کے لیے لیتا ہے اور دینے والا اپنی معاشی اڑان کے حصول کے لئے دیتا ہے۔آخر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جہنم کی بشارت یوں ہی نہیں دی ﴿الرَّاشِیْ وَ الْمُرْتَشِی کِلَاھُمَا فِی النَّارِ﴾ مدارس کے فارغین کی بھی ایک بڑی تعداد سرکاری اداروں کی طرف اسی نقطۂ نظر سے بھاگتی ہے اور نو تشکیل شدہ مدرسہ بورڈ کی حمایت بھی انہی بنیادوں پر بعض حضرات کر رہے ہیں۔

ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تعلیم کو سستا اور عام انسانوں کی پہنچ کے لائق بنا دیں۔ہمارا المیہ یہ ہے کہ جب ساری کمپنیاں اپنی مصنوعات کے نرخ کو کمپٹیشن مارکیٹ میں کم کرتی ہیں، ہمارے یہاں مقابلہ فیس کے بڑھانے کا ہوتا رہا ہے، بلکہ ''زیادہ فیس معیاری تعلیم'' ہماری سوچ کا محور بن گیا ہے، اور جس طرح بغیر سلامی اور جہیز کے مطالبہ کے کوئی لڑکا مل جائے تو ہمیں اس میں نقص معلوم ہوتا ہے، اسی طرح بغیر فیس یا کم فیس والے تعلیمی اداروں کے بارے میں ہماری رائے ٹھیک نہیں ہوتی۔

❁❁❁

This document was created with Win2PDF available at http://www.win2pdf.com.
The unregistered version of Win2PDF is for evaluation or non-commercial use only.
This page will not be added after purchasing Win2PDF.